Lata
Rodri

میراث

پرکاش پنڈت

مکتبہ شاہراہ دہلی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

پہلی بار، نومبر سنہ ۱۹۵۰ء

قیمت تین روپے

(نعمانی پریس، دہلی)

"چندا" کے نام ———

"مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"

ترتیب

پیش لفظ

اس پیش لفظ کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ آج تک میں نے پیش لفظ کی تکنیک پر کچھ پڑھا ہی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید ابھی تک اس کی تکنیک پر کچھ لکھا ہی نہیں گیا ہے۔ پھر بھی پیش لفظ لکھے جاتے ہیں۔ اور بہت اچھے لکھے جاتے ہیں چنانچہ انہیں پیش لفظوں کی بنیاد پر میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ پیش لفظ ریویو یا تنقید سے مختلف چیز ہے۔ یہ بات میں آپ کی اطلاع کے لئے نہیں بلکہ اپنی اطلاع کے لئے لکھ رہا ہوں کیونکہ میرا ذہن اس موضوع پر اس وقت تک صاف نہیں ہوا تھا جب تک کہ مجھے اس عظیم سماجی ذمہ داری سے دوچار ہونا نہیں پڑا۔ شاید یہی ذمہ داری بہت سے لوگوں کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ پیش لفظ متعلقہ کتاب کو بغیر پڑھے ہوئے لکھ دیا کریں۔ بعض وقت تو خود صاحبِ تصنیف کے دل میں یہ جذبہ رہتا ہے کہ اگر پیش لفظ بغیر مسودہ پڑھے ہوئے لکھ دیا جائے،

تو اچھا ہوگا۔ بدقسمتی سے یہ خوبیاں نہ تو پرکاش پنڈت میں ہیں اور نہ مجھ میں۔ اس لئے میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے "میراث" کے تمام افسانے پڑھے ہیں۔ کہیں ڈوب کر، کہیں مزے لے کر تو کہیں اُلجھ کر۔ بالخصوص سرخیوں کے بارے میں اکثر اُلجھ گیا ہوں۔ آخر یہ شخص اپنے افسانوں کی سُرخیاں اتنی پیچیدہ کیوں رکھتا ہے؟ اور جب کبھی بھی میں نے اس راز کو معلوم کرنے کی کوشش کی ہے تو مجھے یہی جواب ملا ہے کہ پرکاش پنڈت دقت پسند واقع ہوئے ہیں جس طرح ان کے افسانوں میں ایک ڈرامائی اختتام اور جملوں میں اعجاز و اختصار ہوتا ہے اسی طرح ان کی سرخیوں میں ایک ڈرامائی طنز ہوتا ہے جسے آپ افسانہ ختم کرنے کے بعد ہی سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ افسانہ غور سے نہ پڑھیں گے تو ممکن ہے کہ آپ کی سمجھ میں صرف سُرخیاں ہی نہ آئیں بلکہ بعض لطیف اشارے، کنائے اور مزاح بھی آپ کی توجہ کا منہ تکتے رہیں۔

پرکاش پنڈت کا یہ رجحان چیخوفین ہے۔ چیخوف کا طنز انسانی ہمدردی اور ترحم کے جذبے میں کچھ ایسا نظر فریب طریقے سے ڈوبا ہوتا ہے کہ آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ اس موقع پہ ہنسنا چاہیئے یا رونا۔ اس کی ہر مسکراہٹ میں آنسو کا ایک موتی، اور آنسو کے ہر قطرے میں مسکراہٹ کی ایک موہنی تصویر ہوتی ہے میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ جب میں نے چیخوف کا ڈرامہ "زن مرید شوہر" پڑھا تو میں خوب ہنسا اور اس وقت تک ہنستا رہا جب تک کہ میرے ایک دوست نے یہ بات نہیں بتائی کہ بھائی یہ رونے کا مقام ہے۔ ویسا قابلِ رحم اور مظلوم کردار مشکل ہی سے کسی نے پیش کیا ہوگا۔ اس کا ردِ عمل مجھ پر یہ نہیں ہوا کہ چیخوف نے مجھے دھوکا کیوں دیا۔ بلکہ اس کے اس آرٹ پر رشک آیا جس نے مجھے خود اپنے

کو بھول جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

پرکاش پنڈت کے دو افسانے "مفلوج" اور "ڈھیٹ" بالکل اسی قسم کے ہیں۔ ڈھیٹ میں سب کچھ کہنے کے بعد پرکاش پنڈت، رام دُلاری اور جے چند کے تعلقات کو نارمل سا بنا دیتے ہیں۔ اور تقریباً یہی چیز "مفلوج" میں ہے۔

پرکاش پنڈت نے افسانہ نگاری کی ابتدا پچھلی جنگِ عظیم کے دوران میں کی اور دیکھتے دیکھتے اس صف میں آ گئے جسے لوگ محسود سمجھتے ہیں۔ جب میں ان کی ترقی کی اس رفتار پر غور کرتا ہوں تو مجھے چند باتیں صاف طور سے نظر آتی ہیں۔

پرکاش پنڈت میں افسانہ لکھنے کی صلاحیت فطری ہے۔ وہ اپنے حافظے کے خزانے کو بڑی اچھی طرح گھنگھالتے ہیں۔ وہ کردار کو گھڑ کر چھوڑ نہیں دیتے ہیں بلکہ اس کے جسم میں ایک فرد کی روح اور ٹائپ کی خصوصیات بھی پھونکتے ہیں۔ کسی بھی افسانہ نگار کے یہاں اس چیز کی موجودگی اس کی کامیابیوں کا بہت بڑا زینہ ہے۔ ایک دوسری چیز جو قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ ان کے لئے ائیڈیلوجی ذہنی تربیت کا نام ہے۔ حقیقت کو دریافت کرنے اور اپنے سطحِ نظر کو مطمئن کرنے کا طریقہ۔ وہ زندگی کے سارے کو سامنے رکھتے ہیں۔ اور اسی مسالے سے ایک کہانی یا افسانہ مرتّب کرتے ہیں۔ جب وقت پرکاش پنڈت نے افسانہ نگاری کی ابتدا کی تو ان کی ذہنی تربیت اتنی مستحکم نہ تھی کہ وہ کسی بھی جزو میں کل کے رشتے کو ڈھونڈھ نکالتے اور کسی بھی ایک مظہر کو تمام دوسرے مظاہر سے جڑا ہوا محسوس کرتے اور اپنے شعور کی دُوربین اس منظر پر گاڑتے جہاں سے بنیادی حقیقت پر نگاہ پڑتی ہے۔ لیکن جوں جوں ان کا شعور پُختہ ہوتا گیا وہ اپنی اس کمزوری

پر غالب آتے گئے۔ وہ تمام بے اطمینانیوں کے جھمیلے میں کسی بنیادی خرابی کا سراغ ضرور لگا لیتے ہیں۔ اس کی بڑی اچھی مثال "میراث" میں ملتی ہے۔ جہاں وہ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ "یہ میراث بہت پرانی ہے"۔ اور جو چیز انھیں اس وقت سب سے زیادہ تکلیف پہنچاتی ہے وہ یہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں موت کے جراثیم آئندہ نسلوں تک نہ پہنچ جائیں۔

پرکاش پنڈت کو چونکہ زندگی سے محبت ہے اس لئے وہ تندرستی، حسن اور تناسب کے دلدادہ ہیں۔ وہ کسی حسین عورت کے پہلو میں کسی مکروہ صورت اور بوڑھے سیٹھ کو دیکھنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ ایک عورت ہے اور دوسرا مرد ہے بلکہ اس لئے کہ اس کی بنیاد سرمایہ دارانہ ہوس اور لوٹ کھسوٹ پر ہے۔

پرکاش پنڈت کو انسانی نفسیات کی پرپیچ راہوں میں اترنے کا بڑا اچھا سلیقہ ہے۔ وہ اپنے کردار کی نفسیات کو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے خارجی رشتوں سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھتے ہیں۔ افسانہ نگار کی کوئی بھی محبوبہ سیٹھ کے روپہلے جال سے آزاد نہیں ہے۔ روپیہ کے محرکات سے آزاد نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھیں قدرے گذارا کرنے والا جوڑا بھی انمل اور بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ وہ ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ زندگی کی ضروریات اور روپوں کے رشتے میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں۔ اور محبت، اطمینان اور خوشی سے محروم ہیں اور آخرالذکر چیزوں کا قحط ان کی زندگی میں اتنا شدید ہے کہ انھیں حاصل کرنے کے لئے وہ کوئی بھی پینترا بدل سکتے ہیں اور ناکامی کی صورت میں کسی بھی قسم کا زک پہنچا سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو افسانہ "گرداب"۔

پرکاش پنڈت کا قلم اور بھی زیادہ چابکدستی کے ساتھ اس جگہ چلتا ہے جہاں وہ اپنے مخصوص ماحول کی ترجمانی کرتے ہیں۔ بالخصوص ایک کلرک کی زندگی کو پیش کرتے ہیں۔

ہندوستانی کلرکوں کی زندگی کو بہت سے لوگوں نے پیش کیا ہے۔ لیکن درمیانہ طبقے یا پیٹی بورژوا کی متضاد کیفیتوں کے ساتھ بہت کم پیش کیا گیا ہے۔ آپ خواہ اُسے کتنا ہی گھسنو کہیں، اس کی مالی مصیبتوں کو پیش کریں۔ لیکن اس کی تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی ہے جب تک کہ اُسے بڑا ہی تنگ نظر نہ دکھایا جائے۔ وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اپنی ناک کی حد سے آگے بڑھنا آسانی سے پسند نہیں کرتا ہے اس کی شخصیت کی یہی دوئی اس کی زندگی میں Pathos پیدا کردیتی ہے۔ "صبح کرنا شام کا" میں آنند سین اور جگل کشور سے زیادہ قابلِ رحم کردار مصنف کا ہے خاص طور سے اس وقت جبکہ وہ یہ کہتا ہے کہ "دراصل میں اطمینان اور بے اطمینانی کے درمیان کھڑا ہوں لیکن چونکہ میرا رُخ شروع ہی سے اطمینان کی طرف رہا ہے اور میں ہمیشہ سے بزرگوں کے کہنے پر چلنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اس لئے بے اطمینانی سے میرے حواس مختل نہیں ہوتے۔ بارہا مجھ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے اپنی خواہش کے خلاف کام کرنے کی مجبوری سے میرے دل میں بڑے خوفناک ارادوں نے جنم لیا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آج بھی میں اپنی خواہش کے خلاف ہی حالات سے سمجھوتہ کئے ہوئے ہوں"۔

اوپر کے پیراگراف میں ایک کلرک کی طبقاتی خصوصیات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ کلرک کا تعلق پڑھے لکھے طبقے سے ہوتا ہے وہ سیاست حاضرہ

کو سمجھتا ہے۔ حکمراں طبقے کی سیاست کو جانتا ہے پھر بھی اپنی دلی خواہش کے خلاف حقیقت کے ساتھ سمجھوتہ کرتا ہے اور اس سمجھوتے پر اتنی کڑی نگاہ رکھتا ہے کہ اپنی زبان سے اپنی دلی خواہش کے اظہار سے بھی جھجکتا ہے۔ یہ چیز اس کے وجود کو دو حصوں میں بانٹ دیتی ہے اور وہ یہ فیصلہ نہیں کر پاتا ہے کہ اسے کس کے ساتھ ہونا ہے اور وہ کس کے ساتھ ہے۔ پرکاش پنڈت کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ وہ انسانی نفسیات کو خارجی ماحول کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار تخیلی کم اور جانے بوجھے زیادہ ہوتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ پرکاش پنڈت اپنے زبردست مشاہدے کے دامن کو ذرا اور وسیع کریں گے۔ اور ان انسانوں کو بھی اپنی کمند میں لائیں گے جنھوں نے اپنی خواہش اور طبقاتی مفاد کے خلاف حقیقت کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔

میں نے ابھی تک پرکاش پنڈت کے ان افسانوں کا تذکرہ نہیں کیا ہے جو ہندو مسلم فسادات یا تقسیم ہند کے واقعات سے متعلق ہیں۔ اس زمرے میں دو ہی افسانے آتے ہیں۔ "ازل سے" اور "تاریکی اور تاریکی"۔

"ازل سے" میں نیلا کا کردار تغیر پذیر ہے، حادثاتِ زمانہ ایک شگفتہ پھول کو افسردہ اور نڈھال بنا دیتے ہیں۔ نیلا زندگی کی رنگینیوں سے غیر متاثر رہتی ہے۔ پھر بھی ایک پُراسرار قوت سے آزاد نہیں ہو پاتی ہے۔ وہ پُراسرار قوّت وہ جنسی جذبہ ہے جو ایک ثانیہ کے لئے اس کے لبوں کو ایک گوشے میں کھلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس میں شُبہ نہیں کہ وہ مسکراہٹ زہر خند بن جاتی ہے اور اسی طرح اس کا عورت پن انسانی بربریت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جاتا ہے

پھر بھی وہ جذبہ موجود رہتا ہے اسی طرح انوپم بھی اسی جذبے سے تھوڑی دیر کے لئے متاثر ہوتا ہے اور جب اس منزل پر پہنچتا ہے کہ اس کے بارے میں بدگمانیاں شروع ہو جاتی ہیں تو وہ ایک بار پھر انسانیت کے پرچم کو اٹھا لیتا ہے یہاں پر کاش پنڈت نے فسادات کے پس منظر میں نفسیات کے پیچ و خم اور انسانی آدرشس کی کش مکش کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ چندرا کا کردار تضاد کے اثرات کو ابھارنے میں بڑا ہی مددگار ثابت ہوا ہے۔

لیکن اس افسانے سے بھی زیادہ کامیاب افسانہ "تاریکی اور تاریکی" ہے یہاں فن کار نے مختصر سی جگہ میں اغوا شدہ عورتوں کے مستقبل کو ہندوستانی سماج میں بڑی تلخی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور باوجود اس امر کے اس افسانے میں تمام ہولناک اور انسانیت کش سانحات کے اثر کو فن کارانہ طور پر اجاگر کیا ہے۔ مصنّف کی نظر نفسیات کی اس تبدیلی پر رہتی ہے جو اغوا شدہ عورتوں پر مرتب ہوتی ہے ہندوستانی سماج میں عورت کا ماضی اس کے مستقبل کا حامی ہے۔ اور جب اس کا ماضی ہی بگڑ گیا ہو تو پھر مستقبل کیا سنور سکتا ہے۔ لیکن کہانی کا المیہ یہیں آکر ختم نہیں ہوتا ہے۔ پرکاش پنڈت اس المیہ پس منظر کے ساتھ آزاد ہندوستان اور پاکستان کی سیہ کاریوں کو بھی بے نقاب کرتے ہیں اور وہ بھی کتنی خوبصورتی سے صرف ایک جملے میں "ہندوستان کی سرزمین پر سب سے پہلے جو چیز اسے دکھائی دی وہ لڑکیوں سے بھرا ہوا ایک فوجی ٹرک تھا جو پاکستان کی طرف رُخ کئے ہوئے کھڑا تھا۔"

ان تمام افسانوں کے پڑھنے کے بعد ان کے فن کے بارے میں میرے جو تصورات تھے انھیں میں جا بجا بیان کر چکا ہوں لیکن ایک دو باتوں کا ابھی تذکرہ باقی ہے۔

پرکاش پنڈت مختلف تاثرات کے ذریعے اپنے کسی مرکزی تاثر کو گہرا کرتے ہیں۔ انھیں فن کے مقتضیات کا بڑا احساس رہتا ہے وہ کبھی اِدھر اُدھر نہیں بھٹکتے۔ ان کا بیان شاعرانہ، پُرتاثیر اور حسّیہ ہے۔ اور یہ ان کی بہت بڑی خوبی ہے لیکن اس سلسلہ میں وہ پڑھنے والے سے اس کی توقع ضرور رکھتے ہیں کہ وہ توجّہ کے ساتھ پڑھتا رہے کیونکہ کہیں کہیں ان کے جملے اپنے مفہوم کو آسانی سے نہیں اُگلتے ہیں۔ ممکن ہے کچھ لوگ اس ذمہ داری سے بھاگنا چاہیں اس لئے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر پرکاش پنڈت اپنے اسلوب اور طرزِ اظہار میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کرلیں تو قارئین اور مصنف کا یہ رشتہ بہت آسان ہوسکتا ہے۔

ان مختصر سے الفاظ کے ساتھ میں پرکاش پنڈت کا تعارف کرانا چاہتا ہوں میں نے پرکاش پنڈت کی صرف تصویر دیکھی ہے۔ سُنا ہے عام افسانہ نگاروں کی نسبت ان کی عمر بہت کم ہے۔ ممکن ہے اس صورت میں آپ یہ سمجھیں کہ میں تعارف کرانے کا مستحق نہیں ہوں۔ لیکن چونکہ میں نے ان کے تمام افسانے پڑھے ہیں اس لئے مجھے اس کا حق ملتا ہے —— پرکاش پنڈت کا مستقبل ایک عظیم افسانہ نگار کا مستقبل ہے۔

ممتاز حسین

کراچی

مفلوج

مسز گوتم کی کڑی نگرانی کے باوجود انڈوں کی بھرجی بھربھری بننے کی بجائے جھلس گئی تھی اور آلوؤں کی ٹکیوں میں تو مصالحہ اس قدر چھوڑا ہوا تھا کہ پہلے ہی پیگ پر مسٹر اے وی نردتم داس گوتم نے زور زور سے چلّانا شروع کر دیا۔ "بلاؤ سور کے بچّے کو اُلّو کے پٹھے کو ذرا بلاؤ۔"

لیکن مسز گوتم نے سوّر کے بچّے یا اُلّو کے پٹھے کو بلانے کی بجائے آلو کا ایک ٹکڑا منھ میں ڈالتے ہوئے پچکارنے کے سے لہجے میں کہا۔ "کہاں ڈارلنگ! نوکروں کو ہر وقت نہیں کوسا کرتے۔"

مگر مسٹر گوتم اُس وقت کسی قسم کی نصیحت سُننے کے مُوڈ میں نہ تھے۔ اور مسز گوتم جانتی تھیں کہ جب وہ اس قسم کے مُوڈ میں نہیں ہوتے تو کیا کچھ ہوا کرتا ہے۔ نوکروں کے بعد مسٹر گوتم کا تمام تر نزلہ انہی پر آن گرتا تھا۔ اور اگرچہ اپنے تہذیب یافتہ ہونے کی صحت

کے مظاہرے کی خاطر وہ اُنھیں ہمیشہ ڈیر یا ڈارلنگ کے خطاب کے ساتھ ہی مخاطب کرتے تھے۔ مگر موٹی موٹی گالیاں دینے میں بھی کم فراخدلی کا ثبوت نہ دیتے تھے۔ چنانچہ دبے گلے سے وہ خود بھی نوکروں کی نالائقی، کام چوری اور نمک حرامی کا اقرار کرنے لگ جایا کرتی تھیں۔

"جانتے تو ہو ڈیر"۔ الماری میں سے مچھلی کا ٹین نکالنے کے لئے اُٹھتی ہوئیں مسز گوتم نے مسٹر گوتم کے کندھوں پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "آج کل نوکروں کا کتنا توڑا ہے"۔ اور اس سے پیشتر کہ مسٹر گوتم نوکروں کے توڑے کی بات پر ہی اناپ شناپ بکنا شروع کر دیتے۔ وہ مچھلی کے ٹین کو کھلوانے کے بہانے کچن کی طرف نکل گئیں۔

اچانک ہاتھ آگئے موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے مسٹر گوتم نے جلدی جلدی ایک بڑا سا پیگ بھرا اور غٹا غٹ پی گئے۔ پھر سگرٹ سلگا کر صوفے کی پُشت پر اپنی پشت گرا دی اور دھواں پینے لگے۔ چوری کے اس پیگ کو بھرنے اور حلق میں اُنڈیلنے کے لئے جتنی پھُرتی سے اُنھوں نے کام لیا اتنی ہی تیزی کے ساتھ اُن کا تمام غم و غصہ ایک ساتھ دُھل گیا۔ اپنے آپ کو ہلکا اور سُبک محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ بیوی کی بے وقوفی پر اُنھیں ہنسی آگئی۔

ادھر کچھ مہینوں سے کہ جب سے اُن کے کندھے کپتانی کے تین پھُولوں کی بجائے میجری کے چمکدار کراؤن سے مرصّع ہو گئے تھے مسز گوتم کو ان کی گرتی ہوئی صحت کا یک لخت الہام ہو گیا تھا۔ اُنھیں وقت پر سُلانے، وقت پر جگانے، وقت پر ناشتہ، لنچ اور ڈنر کرانے کے اہتمام کے علاوہ ان کی روزمرّہ کی شراب نوشی پر پابندی عاید کر کے اس مقصد کے لئے ہفتے میں دو دن مقرّر کر دیئے گئے تھے۔

بدھ اور سنیچر۔ اور بدھ اور سنیچر کے روز بھی وہ اُنھیں چوتھے پیگ سے تجاوز نہ کرنے دیتی تھیں۔

شروع شروع میں مسٹر گوتم اس نادر شاہی حکم پر بہت سیخ پا ہوئے۔ پچھلے آٹھ برس سے وہ بلاناغہ شراب پینے کے عادی تھے۔ اور ان کے کہنے کے مطابق ایک شراب ہی کی بدولت چالیس برس کی عمر میں بھی ان کا رنگ کشمیری سیب کی طرح سُرخ تھا اور اُن کے قدم بڑھاپے کی طرف اُٹھنے کے بجائے اُلٹے پڑ رہے تھے۔ مگر ان کا تمام سٹپٹانا بیکار ثابت ہوا۔ مسز گوتم کے سامنے اُنھیں ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔ یہ بات الگ تھی کہ اب اگر ہر روز نہیں تو ہر دوسرے تیسرے کوئی دوست، کوئی افسر کہ جس کے آگے وہ انکار نہ کر سکتے تھے اُنھیں مدعو کر لیتا تھا۔ یا کلب اور میس کی محفلوں ہی میں اُنھیں مجبوراً ایک دو پیگ اُٹھانے پڑ جاتے تھے۔

مسز گوتم جس وقت طشتری میں مچھلی کے ٹکڑے رکھے واپس لوٹیں اور مسٹر گوتم کو صوفے پر اس بے کسی کی سی حالت میں پڑے دیکھا تو اُنھیں ترس آ گیا۔ "ڈارلنگ بس یہی کھوٹ ہے تم میں!" طشتری کو سینر پہ ٹکاتے ہوئے وہ اُن کی بغل میں بیٹھ گئیں "کیوں اپنی شام خراب کرتے ہو؟"

اور مسٹر گوتم کا چہرہ ایک جھٹکے کے ساتھ پھر دہک اُٹھا پڑے پڑے ہی وہ غرائے۔ "نہیں تم ہی مجھے مارنے پر تلی ہوئی ہو، ڈارلنگ! تم ہی نے، تم ہی نے ڈیر! ان اُلو کے پٹھوں کی کیا مجال ہے"۔

اک ادا کے ساتھ اپنے بھاری بھرکم جسم کو سیٹ کر گلاس میں وسکی اُنڈیلتے ہوئے مسز گوتم نے اپنے جبڑے کے تمام دانتوں اور مسوڑوں کی نمائش کر دی۔

"میری خاطر ڈارلنگ! تمھیں میرے سر کی قسم!" اور اپنا بازو اُن کی گردن کے پیچھے ڈال دیا۔

اور مسٹر گوتم کو بیوی کی حرکتوں سے گھن آنے لگی، اُنھوں نے بیدلی کے ساتھ چُپ چاپ اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور آہستہ آہستہ سپ کرنے لگے۔

بیوی کی اس قسم کی حرکتوں سے اُنھیں ہمیشہ ہی سے نفرت تھی اور وہ شروع زمانے ہی سے اسے ایک حد تک اپنے ناقابل سمجھتے آرہے تھے۔ فوج میں بھرتی ہونے سے قبل بھی کہ جب ان کی شادی نئی نئی ہوئی تھی اور وہ بی اے کرنے کے بعد متواتر تین برس سے بیکار پھر رہے تھے اُنھیں مسز گوتم، مسز گوتم کہلانے کی مستحق دکھائی نہ دیتی تھیں۔ مسز گوتم کا وہ تحکمانہ لہجہ۔ ہر بات میں اڑی اور ہر وقت اپنے ماں باپ کے ہی گُن گاتے رہنا، مسٹر گوتم کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا لیکن سب سے زیادہ جس بات سے اُنھیں چڑ تھی وہ بیوی کے بیجا نخرے تھے کہ بھینس کی بھینس ہونے کے باوجود وہ خود کو دُنیا کی حسین ترین عورتوں میں شمار کرتی تھی اور ہر وقت اپنے چہرے پر دُنیا جہان کے غازے اور پوڈر تھوپے رہتی تھی۔ والد مرحوم کی فوجی خدمات اور سُسر صاحب کی دَوڑ دھوپ کے طفیل مسٹر گوتم نے سیکنڈ لیفٹیننٹ ہوتے ہی بیانگِ دہل اعلان کر دیا کہ وہ اس کی ہر جائز و ناجائز برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر یا کندھے سے کندھا ملا کر اسے سڑکوں یا پارکوں میں گھماتے پھریں۔ یا سنیما تھیٹر یا کسی دوست کے ہاں لے جائیں۔ اور اگرچہ سیکنڈ لیفٹیننٹ سے لیکر میجری

تک کے دس برسوں میں ان کے باہمی تعلقات کئی مرحلے طے کر چکے تھے۔ آج مسز گوتم گھر کی تمام سیاہی سفیدی کی مالک تھیں۔ جسم پہلے سے بھی دوگنا بھدا اور بے ہنگم ہو جانے پر بھی ڈیر اور ڈارلنگ کہلاتی تھیں۔ غازے اور پوڈر کا استعمال اب اس بے دریغی سے نہ ہوتا تھا اور ان کی اس چرب زبانی، اس ہٹی طبیعت میں بھی نمایاں فرق آچکا تھا مگر مسٹر گوتم کا وہ فیصلہ آج تک بغیر کسی تبدیلی کے جُوں کا توں چلا آرہا تھا۔ البتہ کسی وقت خوشی میں آ کر جب مسٹر گوتم اُنھیں "ڈیر بھینس" یا "ہاتھی ڈارلنگ" کا خطاب عنایت کرتے تو چیں بجبیں ہونے کی بجائے اُن کی ڈھلکی ہوئی چھاتیوں میں زیر و بم پیدا ہو جاتا اور چار بچے جَن چکنے کے سبب قدرتی طور پر بڑھے ہوئے پیٹ میں لہریں سی ناچنے لگتیں اور کھٹ سے جبڑوں سمیت بتیسی نکل آتی ——— کہ مسٹر گوتم کو اچانک کلب جانے، کسی پارٹی میں شریک ہونے یا دفتر میں کام کی زیادتی کی بات یاد آجاتی۔

مسٹر گوتم نے مچھلی کا ٹکڑا منھ میں ڈالنے سے پیشتر طشتری کو اٹھا کر سونگھا تو اس میں سے بُو آرہی تھی۔ مگر اس دفعہ نہ جانے کس خیال کے زیرِ اثر کچھ کہنے کی بجائے اُنھوں نے مسز گوتم پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالنے پر ہی اکتفا کیا اور پھر جو گلاس میں وسکی انڈیلنے لگے تو انڈیلتے ہی چلے گئے۔

مسز گوتم اُن کا ہاتھ نہ روک سکیں۔

مسز گوتم اکثر ان کا ہاتھ روکتے روکتے رہ جاتی تھیں۔ اُن کی لاکھ ہدایتوں اور کوششوں کے باوجود مسٹر گوتم کو کسی نہ کسی چیز میں کوئی نہ کوئی نقص نظر آہی جاتا تھا۔ اور جب اُنھیں کوئی نقص نظر آجاتا تھا تو گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی تھی۔

نوکروں کو گالیاں، بیوی اور بچوں کو گالیاں، دوستوں، واقف کاروں، ماتحتوں اور افسروں کو گالیاں۔ اور جب گالیاں نکال چکنے کے فوراً بعد یا کہیں درمیان ہی میں وہ ایک دم سنجیدگی اختیار کر لیتے تو مسز گوتم کو اُن کا ہاتھ روکنے کی جرأت نہ ہوتی۔ مسٹر گوتم کی چار پیگوں کی قسم ٹوٹ جاتی۔ پیگ بڑے ہو جاتے اور وہ اس وقت تک برابر پیگ پر پیگ اُنڈیلتے رہتے جب تک کہ بوتل دھونے کے لائق نہ ہو جاتی یا اُنھیں یقین نہ آ چکتا کہ اُنھیں سُرور آ چکا ہے۔ سُرور آ چکنے کے بعد اُنھیں برما کے محاذ اور لنکا کی محفلیں یاد آنے لگتیں۔ دنوں کیچڑ میں دھنسے پڑے رہنا۔ بارہ بارہ گھنٹے کی لگاتار جھڑی، سیلاب، جونکیں اور مچھر، اور دشمن کے بڑے دہانے کی توپوں کے دھماکے۔ ہوائی جہازوں کی بمباری اور ہر لحظہ شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی زندگی اور موت کی کش مکش۔ اور، اور وہ رقص و سُرود، ہر رنگ اور ہر نسل کی نازنینوں کے نیم عُریاں تھرکتے ہوئے جسم کپتانی کے عہدے کا پُر تمکنت احساس اور شراب، اور وہ یا تو اپنی دونالی میں کارتوس بھر کر بنگلے سے باہر نکل جاتے اور پُرانے قلعے کی جانب جاتی ہوئی سڑک کے اس طرف مرغیوں کے ڈربے یا نوکروں کے کوارٹروں کی آڑ لیکر اس پہاڑی گیدڑ کا انتظار شروع کر دیتے جو قریبی جنگل سے آکر رات رات بھر اُن کے بنگلے کے ارد گرد گھوما کرتا تھا۔ اور بالکل انسانوں کی سی آوازیں نکالتا تھا یا پھر وہ اپنی بے تکی آواز میں "کتھاں گجاری آ رات ڈھولا" کا پوٹھو ہاری گیت اونچے نیچے سُروں میں اَلاپنے لگتے۔ اور مسز گوتم کو ڈیر، بھینس اور ہاتھی ڈارلنگ کے خطاب کے ساتھ ساتھ ان کے ایک میجر کی بیوی ہونے

اور اس طرح کے شاندار بنگلے میں رہنے پر پُر پیچ گالیوں میں تعجب کا اظہار کرتے۔

وِلزلی روڈ پر واقع وہ شاندار بنگلہ جس کا پھاٹک مشرق کی طرف کھلتا تھا اور جہاں سے قریبی جنگل اور پرانے قلعے کے شکستہ میناروں کا نظارہ صاف طور پر کیا جا سکتا تھا۔ انھیں حال ہی میں حکومت کی طرف سے ملا تھا۔ اس سے پیشتر مسٹر گوتم فوجی میس میں رہتے تھے۔ اور مسز گوتم بمعہ اپنے چاروں بچّوں کے اور دونوں نوکروں کے پرانی دلّی کی ایک گنجان آباد گلی میں۔ پاکستان بننے سے پیشتر اور جنگ کے دوران میں چونکہ مسٹر گوتم کو اکثر ملک کے دُور دراز علاقوں میں رہنا پڑتا تھا، مسز گوتم لاہور میں اپنے والدین کے ہاں رہتی تھیں۔ نسبت روڈ پر واقع۔ اس چھوٹے سے مکان میں ہر وقت ایک ہنگامہ، ایک طوفانِ بدتمیزی برپا رہتا تھا۔ اور مسز گوتم اُس کی حد تک اس ہڑبونگ کی عادی ہو چکی تھیں۔ بچے چیخ چلا رہے ہیں۔ لیکن نوکروں کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ کھونٹیوں کے کپڑے کونوں کتروں میں، ٹوٹے ہوئے ریکٹ اور بلّے ڈریسنگ ٹیبل پر صابن دانیاں اور تیل کی شیشیاں رسوئی گھر میں اور گیلے تولئے اور دانتوں کے برش ڈرائنگ روم میں۔ مگر یہاں آکر ایک دُنیا بدلنا تھی۔ بچّوں کو ایک میجر کے بچّے اور بیوی کو ایک میجر کی بیوی بننا تھا۔ مالی سے بھنگی اور بھنگی سے خانساماں کا کام نہیں لینا تھا اور مسٹر گوتم کو کہ ایک دُنیا دیکھ چکے تھے اور فوجی تربیت کے کارکن ہر حرکت، ہر فعل میں سلیقہ اور باقاعدگی دیکھنے کے متمنی تھے۔ گھر میں قدم رکھتے ہی سارا بنگلہ سر پر اٹھا لینے کی ضرورت محسوس ہو جاتی اور پھر شراب۔

گلاس کو ہاتھ میں لے کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور کھڑکی کا پردہ اُٹھا کر باہر تاریکی میں گھُورنے لگے۔ جنگل سے آنے والی سرد ہوا کے جھونکوں نے ان کی کنپٹیوں کو

سہلانا شروع کر دیا اور جلد ہی اُنھیں احساس ہو گیا کہ ان کا سرور کس ڈگری تک پہنچ چکا ہے۔ ہاتھ کے پیگ کو ختم کر چکنے کے بعد وہ دوبارہ آ کر صوفے میں دھنس گئے اور مسز گوتم کے کچن میں چکر لگانے کی غرض سے اُٹھ جانے کے سبب منہ بگاڑ بگاڑ کر جُھلسے ہوئے انڈے اور سڑی بُسی مچھلی نگلنے لگے۔ اچانک اُنھیں پچھلے اتوار کو مسز بھاردواج کے ہاں کھائے ہوئے انڈوں کے حلوے کی یاد آ گئی۔

مسز بھاردواج اُن کے ماتحت کیپٹن رلیا رام بھاردواج کی بیوی تھیں۔ وہ جب سے دہلی میں تعینات ہوئے تھے اور جب سے مسٹر بھاردواج کو ان کی شراب نوشی، ان کی رنگیلی طبیعت کا علم ہوا تھا، وہ لوگ ہر اتوار کو اپنے ہاں ہونیوالی سنڈے سٹنگ میں انھیں ضرور مدعو کرتے تھے۔ محفل میں مسٹر اور مسز بھاردواج کی دو نوجوان لڑکیوں کے علاوہ دوسری اعلیٰ گھرانوں کی عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں۔ وہاں کسی قسم کے تکلف کی گنجائش نہ تھی۔ دوستوں کی طرح اکٹھے مل بیٹھنا، ہنسی مذاق کھانا پینا ہوتا تھا، سیر و تفریح کے پروگرام بنتے تھے اور سارا دن ہنستے کھیلتے گذر جاتا تھا۔ اور یہ ان سنڈے پارٹیوں ہی کا صدقہ تھا کہ مسٹر گوتم کو مَیں کی آزادانہ زندگی ہفتے میں ایک آدھ بار ہی یاد آتی تھی۔ مسٹر گوتم سے بارہا وہ لوگ مسز گوتم کو ہمراہ لانے کے لئے کہہ چکے تھے۔ مگر وہ ہر بار ٹال مٹول کر جاتے۔ کوئی بہانہ تراشتے وقت انھیں کتنی کوفت ہوتی تھی۔ نازک اندام اور ہنس مکھ نازنینوں کے درمیان ایک بھاری بھرکم جسم کی بدشکل اور بے ہنگم اور محفلوں کے آداب سے قطعاً بے بہرہ عورت کے تصور ہی سے ان کا دل کباب ہو جاتا۔ رمی یا برج کھیلتے ہوئے جب دستور کے مطابق اپنی بیوی کو مخالف سمت میں بٹھلانے کی بات اُٹھتی اور مسز بھاردواج کی دونوں نوجوان اور

چلبلی لڑکیاں اُن کے گھٹنوں پر بیٹھ کر اور ان کی گردن میں بازو حمائل کر کے مسز گوتم مسز گوتم کا شور مچانے لگتیں تو فرطِ رنج سے وہ ڈوب جاتے اور کھیلنا، بات کرنا ایک بار ہو جاتا۔ اور وہ رات نوکروں اور بچوں اور مسز گوتم کی شامت کی رات ہوتی۔

بیوی کی بدصورتی کو تو وہ کسی طرح نظر انداز کر سکتے تھے۔ بلکہ اس کی بدصورتی کی آڑ لیکر لوگوں کی نگاہوں میں وہ خود کو زیادہ قابلِ رحم انسان منوا سکتے تھے۔ مگر اونچے درجے کے لوگوں میں اُٹھنے بیٹھنے کی صلاحیت کا جو اس میں فقدان تھا اسے کسی صورت بھی نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا۔ اگر ایک بار بھی اسے اس قسم کی کسی محفل میں شریک کر لیا گیا، مسٹر گوتم کا خیال تھا کہ وہ برسوں سے چلے آرہے کسی بیکار خاوند کی بیوی ہونے ہی کے اہل تھی، تو اُنھیں عمر بھر پچھتانا پڑے گا۔ اتنی سی بات پہ ہی وہ ان کے بیگانی عورتوں کے ساتھ ناجائز راہ و رسم کا ڈھنڈورہ پیٹ دیگی اور کچھ تعجب نہیں جو اپنا سر بھی پیٹ لے، اس کے سر پیٹ لینے کا تو اُنھیں تلخ تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ وہ ان دنوں سیلون سے چھٹی پر آئے ہوئے تھے اور اُنھوں نے برسبیل تذکرہ اپنی وہاں کی زندگی کے متعلق صرف اتنا کہہ دیا تھا کہ اگر اُنھیں ہوٹلوں وغیرہ میں جانے کی اجازت نہ ہوتی۔ اور نہ ہی میڈم لوئی ایسی مہمان نواز عورت سے ان کا واسطہ پڑتا تو بھلے چنگے آدمی کو بیمار اور کمزور کر دینے والی وہاں کی آب و ہوا، اور خوراک اُن کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتی۔ میڈم لوئی سے ان کا صرف اتنا ہی تعلق تھا کہ وہ اُنھیں اپنے مرحوم خاوند میجر لوئی کی باتیں، اس کے کارنامے بڑے چاؤ سے سُنایا کرتی تھی۔ اور اُنھیں وقت بے وقت اپنے گھر آنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اپنے کمسن لڑکے سے وہ اُنھیں فوجی سلام کرواتی۔ اُنھیں، فلاں چیز کافی مقدار

میں کھا لیجیے، فلاں کو سونگھنے تک کی کوشش نہ کیجیے وغیرہ ہدایات دیا کرتی تھیں۔ اور کبھی کبھار شاپنگ یا چہل قدمی کرنے ان کے ساتھ نکل جاتی تھی مگر مسز گوتم پر کچھ یہ حقیقت نازل ہوگئی کہ سیڈم لوئی کے ساتھ ان کے میاں بیوی کے تعلقات قائم ہو چکے تھے اور یہ کہ کچھ ہی دنوں کے بعد وہ بدکار عورت اُن کا نام کٹوا کر انھیں لندن لے اُڑے گی۔ اور اس بات پر خاندان بھر میں وہ لے دے ہوئی کہ چھٹیاں ختم ہونے سے قبل ہی اُنھوں نے واپسی کا ٹکٹ کٹوا لیا اور لگاتار دو مہینے تک سُسر صاحب کی طرف سے ہر تیسرے چوتھے آدھمکنے والے خط کو بغیر پڑھے ہی پھاڑتے رہے۔

مسز گوتم ابھی تک کچن سے واپس نہ لوٹی تھیں کہ ساتھ کے بیڈ نگ روم میں ننھے وجے نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ مسٹر گوتم برداشت نہ کر سکے۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لئے گھر میں آیا رکھنے پر وہ بارہا زور دے چکے تھے مگر مسز گوتم تھیں کہ ان کی ایک نہ سُنتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ چاہے مسٹر گوتم کو کمانڈر انچیف ہی کا عہدہ کیوں نہ مل جائے۔ بچوں کو وہ کسی دوسری عورت کے رحم پر نہیں چھوڑ سکتیں۔ "ڈارلنگ! کہاں جا کر مرگئی ہو؟" مسٹر گوتم آپے سے باہر ہو گئے۔ "ان حرامخوروں میں سے ہی کسی کو بھیج دو؟" لیکن جا کر مر رہنے والی یا کسی حرامخور کی آمد سے قبل ہی وہ خود لڑکھڑاتے ہوئے بیڈ نگ روم میں جا پہنچے اور وجے کو تھپتھپانے لگے۔ سُلانے کے ہوائی بوسوں اور گالیوں کے ساتھ ساتھ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سادھو بن جانے کا ورد بھی کرنے لگے۔

مسز گوتم نے کمرے میں جھانکتے ہوئے اطّلاع دی کہ کھانا چُنا جاچکا ہے اور ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ پھر سے کچن یا ڈائننگ روم کا ملاحظہ کرنے چلی جاتیں۔ مسٹر گوتم نے ایک فوجی کڑک اور ایک بہت ہی موٹی سی گالی کے ساتھ اُنھیں حواس باختہ کردیا۔

"ڈارلنگ کچھ ہوش کرو۔" مسز گوتم منمنائیں۔ "بچّے جاگ اُٹھیں گے۔" اور بڑھ کر ان کا بازو تھامتی ہوئیں، لیکن اُنھیں اٹھانے سے زیادہ ان پر گرتی ہوئیں، اپنی مخصوص ہنسی کے ساتھ پھر چہکیں۔ "چلو اُٹھو کھانا کھالو۔"

اور میجر اے وی نروتم داس گوتم ایک سعادت مند بچّے کی طرح اُٹھ کھڑے ہوئے۔

●

صبح کرنا شام کا.....

اس وقت رات کے دس بجے ہیں ، اندرسین میرا روم میٹ وارث شاہ کی ہیر میں سے رانجھے کے وہ بول گنگنا رہا ہے جس میں ہیر سے مخاطب ہو کر وہ کہتا ہے کہ اے ہیر بچھے ہوئے پلنگ تیرے منتظر ہیں اور تو ان نرم و گداز بچھونوں کے تصوّر سے خوش ہو رہی ہے۔ لیکن میرا بستر کنکر اور کانٹے بنیں گے۔ تمہارے وہ وعدے کیا ہوئے؟ کیا ہوئیں تمہاری وہ قسمیں؟ میرا دوسرا روم میٹ جگل کشور حسبِ معمول چارپائی پر نیم دراز حالت میں پڑا، اپنی بیوی اور بیٹی کی تصویر گھٹنوں کے بیچ ٹکائے بیڑی پی رہا ہے اور میں تمھیں خط لکھ رہا ہوں۔

تم نے لکھا ہے کہ چونکہ ہیڈ آفس سے میری جگہ تمھیں یہاں بھیجنے کے احکام آچکے ہیں۔ اس لئے یہاں آنے سے قبل اندازے کے طور پر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ یہ جگہ کیسی ہے؟ یہاں کے لوگ کیسے ہیں؟ رہنے کے لئے کوئی مکان مل سکیگا

یا نہیں؟ مکان نہ ملنے کی صورت میں رہائش اور کھانے کا کیا انتظام ہوگا۔ اور یہ کہ میں نے اس جگہ کو پسند کیا ہے یا نہیں؟

تمھارے اندازے کے لئے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ تمھیں یہاں کوئی مکان نہ ملے گا۔ قصبہ ہے تو کیا آخر ہندوستان ہی کا ایک حصّہ ہے۔ اور ہندوستان کے کسی حصّے میں بغیر پگڑی کے مکان حاصل کرنا ناممکن سی بات ہے اور چونکہ پگڑی دینا تمھارے لئے ناممکن سی بات ہے اس لئے تمھیں دل بہار ہوٹل کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں اندرسین اور جگل کشور کے ساتھ رہنا ہوگا۔

تم چونکہ دل بہار ہوٹل کے مستقل مکیں ہوگے اس لئے دل بہار ہوٹل کا بدمزاج مالک سیٹھ دلباغ رائے عام گاہکوں کی نسبت تمھارے ساتھ قدرے بہتر سلوک کریگا اور ہماری طرح اگر تم بھی باقاعدگی کے ساتھ یعنی ہر مہینے کی یکم تاریخ کو پندرہ روپے کرائے کے، پینتیس روپے خشک کھانے کے اور دیگر چائے وغیرہ کے بل اس کی نذر کرتے رہوگے تو قصبے میں کوئی تمھاری ہوا کی طرف بھی نہ دیکھ سکے گا۔ ہاں، اس پر کسی طرح کا رعب گانٹھنے کی کوشش نہ کرنا۔ کسی چیز میں کوئی نقص نہ نکالنا۔ ہوٹل کے بیروں کو جنھیں وہ ماں بہن کی سناتا ہے اور اکثر ایک دو ہاتھ بھی جڑ دیتا ہے، کبھی سخت سست نہ کہنا۔ بائی جی یعنی اس کی بیوی کی طرف جو اسی ہوٹل کے کمرہ نمبر ۴ میں اپنی بدصورتی، پینتیس سالہ عمر اور تین بچّوں کے ساتھ رہتی ہے۔ اور کبھی ہفتہ عشرہ کے بعد ہی نظر آتی ہے، آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھنا۔

دراصل یہ ایک رہائشی مکان ہے جسے آج سے دس برس پہلے قصبے میں بیڑی کے ایک بہت بڑے کارخانے اور ہمارے بینک کی شاخ (جس میں ہم

ملازم ہیں) کے کھل جانے پر موقع شناس دلباغ رائے نے ہوٹل کی شکل دے دی تھی۔ کہتے ہیں دلباغ رائے اُن دنوں صرف موقع شناس تھا۔ بدمزاج اور سیٹھ نہیں تھا۔ بدمزاج اور سیٹھ بنے اسے صرف چار ایک برس ہوئے ہیں۔ یعنی جب اس نے چوبی تخت پوش، بنچ اور لوہے کی کرسیاں اُٹھوا کر ان کی جگہ قدرے بہتر قسم کا فرنیچر بنوایا۔ اور بیٹری سے چلنے والا ایک ریڈیو سیٹ خریدا۔

ہوٹل میں کُل ملا کر چار رہائشی کمرے ہیں۔ جن میں سے ایک تو مستقل طور پر ہمارے پاس ہے، دوسرا مستقل طور پر سیٹھ کے پاس ہے۔ اور باقی کے دو مستقل طور پر خالی رہتے ہیں۔ کبھی جب ہمارے نصیب جاگتے ہیں تو ہفتوں بلکہ مہینوں بند رہنے والے ان کمروں میں بھی زندگی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ بڑوں کا کوئی وضعدار سوداگر، جسے کارخانے میں سونا پسند نہ ہو، کسی بیمہ کمپنی کا مفلوک الحال ایجنٹ جسے ہنومان کے مندر میں رہنے سے اچھے کیس ملنے کی اُمید نہ ہو یا پھر کوئی ایسا جوڑا جس نے ہنی مُون منانے یا اسی قسم کے کسی دوسرے مقصد کے لئے اس قصبہ کا انتخاب کیا ہو۔ لیکن ایک بات پر تم ضرور حیران ہو گے کہ ان دو کمروں کے اکثر خالی رہنے کے باوجود ہوٹل کے کسی بیرے کو ان میں سونے کی اجازت نہیں ہے۔ اور ان جاڑے کے دنوں میں بھی وہ ہال کمرے کی یخ بستہ لمبی میز پر پڑے گھٹنوں کو سینے سے لگاتے دلباغ رائے کو دعائیں دیا کرتے ہیں۔

ہال کمرہ کوئی باقاعدہ ہال کمرہ نہیں ہے۔ کسی زمانے میں گھر کا آنگن رہا ہوگا لیکن اب اس پر ٹین کی چادریں ڈال کر اور بوسیدہ دیواروں پر سبز رنگ کا پھولدار کاغذ منڈھ کر باقاعدہ ہال کمرہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہیں ایک طرف

لکڑی کے تختوں کی چھوٹی سی دیوار کھڑی کر کے کچن بنایا گیا ہے۔ کچن کے لئے ایسی موزوں جگہ کا انتخاب دلباغ رائے کی کمال ذہنیت کا بین ثبوت ہے صبح اور شام جب کچن میں سے پتھری کوئلوں کے گاڑھے اور بدبودار دھوئیں کے بھبکے اُٹھتے ہیں۔ اور ہال کمرے میں بیٹھ کر چائے پینے والے گاہکوں، جن میں زیادہ تعداد مقامی کارخانے کے مزدوروں کی ہوتی ہے، کی مزاج پُرسی کرتے ہیں تو گاہک آدھی سے زیادہ چائے آنکھوں کے راستے اُگلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر جب خود دلباغ رائے کے لئے کاؤنٹر پہ بیٹھنا اور حساب کتاب کرنا محال ہو جاتا ہے تو وہ عجیب شانِ بے نیازی سے اُٹھتا ہے اور خانساماں کو ماں بہن کی گالی دیکر ریڈیو چھیڑ دیتا ہے اور ریڈیو سے نغمے کی لے پھوٹتے ہی تحسین طلب نگاہوں سے گاہکوں کی طرف دیکھتا ہوا دوبارہ کاؤنٹر پہ آ بیٹھتا ہے .... قدآدم الماری کے اُوپر سوٹے گتّے کے خول میں بحفاظت رکھے ہوئے ریڈیو کو اس کے علاوہ کوئی شخص ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ ہم، ہوٹل کے مستقل مکین بھی، کہ جب کبھی ہمیں ریڈیو سُننے کا شوق چراتا ہے (عموماً یکم تاریخ کو یا جس دن جگل کشور کی بیوی کا خط آتا ہے) اور دلباغ رائے کو حساب کتاب میں مشغول دیکھ کر ہم میں سے کوئی ریڈیو کا سوئچ گھمانے کا عظیم گناہ کر بیٹھتا ہے تو جیسے دلباغ رائے کی روح اس کے حلق میں آ اٹکتی ہے۔ اسے سارا حساب کتاب بھول جاتا ہے۔ اور وہ ہماری طرف کچھ ان نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے جیسے ریڈیو کے سوئچ کو نہیں ہم نے اس کی بیوی کے پستان کو چھو لیا ہو۔

جو ہو، اپنے فرصت کے لمحات تمھیں ہال کمرے ہی میں گذارنے ہونگے

کیونکہ قصبے میں سوائے ہنومان کے مندر کے کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں دل بہلا دے کا کوئی سامان ہو۔ اور اس مندر میں بھی صرف منگل کے روز ہی رونق ہوتی ہے۔ یعنی اگر اسے رونق کہا جا سکتا ہے۔ بھٹیارنوں ایسی کالی کلوٹی اور مکروہ عورتوں کو مندر کے گھنٹے بجاتے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر آرتی اتارتے دیکھ کر تمھیں وحشت ہونے لگے گی۔ تمھاری نظر میں دہلی کے کناٹ پلیس، چاندنی چوک اور اجمل خاں روڈ کا بے پناہ حُسن گھوم جائے گا۔ تم اُداس ہو جاؤ گے اور تمھیں پہلی بار محسوس ہو گا کہ ہیڈ آفس نے تمھارے ساتھ کتنی بڑی زیادتی، کس قدر ناانصافی کی ہے۔ اس کے علاوہ مندر کے پُجاری اور دوسرے ہنومان کے بھگت تمھاری طرف ایسی خطرناک نگاہوں سے دیکھیں گے جیسے تم کسی سیتا کو اغوا کرنے کی نیّت سے وہاں پہنچے ہو۔

رہے اندرسین اور جگل کشور تو اندرسین سے تمھاری اس لئے نہیں بنے گی کہ وہ بہت کم گو ہے، کوئی زیادہ بولے تو بگڑ جاتا ہے۔ اور جگل کشور اس قدر باتونی ہے کہ تم بہت جلد اس سے عاجز آ جاؤ گے۔ اس کی بیوی اور بیٹی کی باتیں جنھیں وہ ایک ہی ڈھنگ سے ہر روز دہراتا ہے تمھیں پریشان کر دیں گی۔ ایک حزیں سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ تمھیں بتائیگا کہ اس کی بیوی اپنی چار سالہ بیٹی کے ساتھ مشرقی پنجاب کے ایک دور دراز گاؤں میں رہتی ہے وہ ہر ماہ اسے منی آرڈر سے چالیس روپے بھیجتا ہے اور ہر ہفتہ اسے پوسٹ کارڈ لکھتا ہے اور تم دیکھو گے کہ کس بے چینی سے وہ بیوی کے خط کا انتظار کرتا ہے کبھی کسی وجہ سے جواب آنے میں ایک آدھ دن کی دیر ہو جائے گی تو اسے کیسے کیسے خیالات آنے لگیں گے۔ وہ ہر روز صبح اُٹھتے ہی ہال کمرے میں جا کر اس لئے اخبار پڑھتا ہے کہ ہندوستان کے نت نئے حالات کا اثر مشرقی پنجاب پر کیا پڑ رہا ہے؟

مشرقی پنجاب میں گندم اور دیگر اشیائے خوردنی کے بھاؤ میں کس قدر اضافہ ہوا ہے؟
مشرقی پنجاب میں کوئی غیر معمولی حادثہ تو نہیں ہوا۔ اور اس کے بعد وہ تم سے روز افزوں
گرانی پر تبادلۂ خیالات کرے گا۔ تم سے پوچھے گا کہ آخر یہ حکومت ہمارے لئے کیا کر رہی
ہے اور پھر خود ہی جواب دے گا کہ یہ حکومت ہمارے لئے کچھ نہیں کر رہی۔ حکومت
ہمارے لئے کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ وہاں اس کی بیوی اور بیٹی پھٹے حال اور بھوکے
پیٹ رہتی ہیں۔ اور یہاں پیٹ پر پتھر باندھے وہ خود دِنوں کو دھکے دے رہا ہے
دراصل اس کا مطالعہ نہایت سطحی ہے اور گھوم پھر کر وہ ہمیشہ بیوی اور بیٹی ہی پر تان
توڑتا ہے۔ اس کے علاوہ تم اُسے نہایت چھوٹے دل کا انسان پاؤ گے۔ صابن اور
تیل تک وہ بکس میں بند کر کے رکھتا ہے۔ دو وقت کی ۔ روٹی کے علاوہ کبھی کچھ نہیں
کھاتا تم اگر اُسے چائے پینے کی دعوت دو گے تو بھی اس خیال سے کہ کبھی اُسے نہ
پلانا پڑے وہ چائے نہیں پئے گا۔ لیکن بظاہر وہ یہ کہے گا کہ اُسے ڈر ہے کہیں
اُسے چائے کا چسکا نہ پڑ جائے۔ اور یہ کہ مشرقی پنجاب کے ایک دُور دراز گاؤں
میں بیٹھی چالیس روپے کے منی آرڈر کا انتظار کرنے والی اس کی بیوی اور ماں کے
ہاتھوں کی طرف دیکھنے والی اس کی بیٹی اُسے مُنہ کے مزے سے کہیں زیادہ عزیز ہیں
چائے صرف تم پیا کرو گے کیونکہ اندر سین بھی چائے نہیں پیتا۔ چائے کے بجائے
وہ شراب پیتا ہے۔ یکم تاریخ کو ہوٹل کے بل ادا کرنے کے بعد اس کے پاس جتنی رقم
بچتی ہے وہ اس کی دیسی شراب کی بوتلیں لے آتا ہے ....
.... اس کا کہنا ہے کہ وہ شراب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور کسی کسی دن تو
اس پر کچھ ایسا جنون طاری ہو جاتا ہے کہ رات بھر جب تک وہ بالکل اوندھا نہیں

ہوجاتا برابر شراب کے گلاس بھر بھر کے حلق میں انڈیلتا رہتا ہے۔ یہ شراب ایک ہفتہ سے زیادہ کبھی نہیں چلتی۔ باقی کے تین ہفتے وہ بہت پریشان رہتا ہے۔ ان دنوں وہ کسی سے مُطلق بات نہیں کرتا۔ آدھی آدھی رات تک ہیر پڑھتا رہتا ہے۔ آہیں بھرتا ہے اور کبھی کبھی رونے لگتا ہے۔

تم سے یقیناً اس کا رونا نہیں دیکھا جائے گا۔ اور واقعی ایک اچھے خاصے سمجھ دار نوجوان کو یوں بچّوں کی طرح پھپھک پھپھک کر روتے دیکھ سکنا کوئی مذاق نہیں ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اسے شریف یعنی متوسط طبقے کے نوجوان کی طرح زندگی گذارنے کا سلیقہ نہیں، وہ شرابی ہے اور شراب نوشی کو ہمارے سماج میں بداخلاقی سمجھا جاتا ہے تمھیں اس پر رحم آئے گا۔ اور ممکن ہے کسی دن اپنی گرہ سے پیسے خرچ کرکے تم اُسے شراب پلانے پر مجبور ہوجاؤ۔ وہ جب شراب پی لیتا ہے تو بڑی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ تم کہوگے کہ ہر شرابی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ لیکن تم دیکھوگے کہ اس کے بہکنے اور عام شرابیوں کے بہکنے میں کس قدر غیر معمولی فرق ہے تو دُکے دنوں میں جب تم اُسے شراب پلاؤگے تو وہ تمھیں اپنی محبت کی داستان سُنائے گا۔ اگرچہ اس کی داستان ناکام محبت کی عام داستانوں سے مختلف نہیں لیکن جس زاویہ نگاہ سے وہ اپنی ناکامی کا تجزیہ کرے گا۔ اور جس طرح ایک فرد کی ناکام محبت اور ملک کی سیاست کے ڈانڈے ملائے گا تمھیں از حد تعجب ہوگا۔ اور کچھ یُونہی تم سوچنے پر مجبُور ہوجاؤگے کہ اس کا بہکنا، بہکنا نہ ہوکر کچھ اور ہے۔ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جسے کسی طرح جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ غیر ارادی طور پر تمھیں اس سے یک گونہ اُنس ہوجائے گا اور اس کی باتوں سے تم اس خوش فہمی میں مُبتلا ہوجاؤگے کہ اُس نے

تمھیں اپنا جگری دوست بنا لیا ہے لیکن دوسرے دن جب تم اُٹھو گے اور وہ چارپائی پر بیٹھے بیٹھے چھت کی کڑیاں گن رہا ہوگا تو وہ تم سے بات تک نہیں کرے گا۔ تمھارے بلانے سے اُسے کوفت ہوگی۔ زیادہ بلاؤ گے تو چڑ جائے گا۔ دفتر میں بھی اس کی یہی حالت ہے۔ کلرک اس کا لاکھ مذاق اُڑاتے رہیں وہ پرواہ نہیں کرے گا ایک کان سے سُنے گا اور دوسرے سے نکال دے گا۔ لیکن جونہی اُسے کوئی بُلائے گا میرا مطلب خواہ مخواہ بُلانے سے ہے۔ جیسا کہ عام کلرکوں کی ذہنیت ہوتی ہے تو وہ اُسے ایسے آڑے ہاتھوں لے گا کہ سب بھیگی بلی بن جائیں گے۔ دراصل وہ کسی سے نہیں ڈرتا اُسے کسی کی پروا نہیں۔ تعجب کہ نوکری کی بھی نہیں!

اس صورتِ حال میں اپنی شامیں گذارنے کے لئے تمھارے پاس صرف دو راستے ہوں گے:-

۱۔ ہال کمرے میں بیٹھنا، مقامی کارخانے کے مزدوروں سے گپ لڑانا؛ اُنھیں دہلی کی عالیشان عمارتوں، ہوٹلوں، سینماؤں اور ناچ گھروں کی باتیں سُنا سُنا کر حیران کرنا۔ دلباغ رائے کی نوازش سے ریڈیو سننا اور چائے پینا۔

۲۔ تنہا ٹہلنے جانا اور یونہی بے مطلب اور بے سروپا باتیں سوچ سوچ کر پریشان ہونا۔

موخرالذکر راستے پر چلنے کی میں تمھیں کبھی تلقین نہ کروں گا۔ یہ بڑا ٹیڑھا اور پُرخار راستہ ہے۔ دہلی کی سڑکوں پر تم تنہا گھومے ہو اس میں شک نہیں۔ لیکن دہلی کی سڑکوں اور یہاں کی پگڈنڈیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دہلی کی سڑکوں پر تنہا گھومنے کے باوجود تمھیں تنہائی کا ایسا شدید احساس نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اپنے ایسے

لکھوکھا انسانوں کے ہجوم میں تمہاری انفرادیت اس شدت کے ساتھ بیدار ہوسکتی ہے یہ ہجوم تمہیں انفرادی طور پر کچھ نہیں سوچنے دیتا، فلک بوس عمارات، عیش و عشرت کے سامان دیکھ کر تمہارے دل میں ایک ٹیس تو اُٹھ سکتی ہے ایک درد پیدا ہوسکتا ہے لیکن دہلی کی گہما گہمی سے ہزاروں میل دُور اس چھوٹے سے قصبے کی ایک ویران پگڈنڈی پر تنہا گھومتے ہوئے جس حسرتناک محرومی سے تم متعارف ہوگے اس کے تصور ہی سے، اس وقت جبکہ میں تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں میرا دل کانپ اُٹھا ہے۔ تمہیں ملازم ہوئے چونکہ ابھی صرف چھ ماہ ہوئے ہیں اور ابھی تک تمھیں ایسی کسی جگہ نہیں بھیجا گیا جہاں کی دُنیا تمہارے لئے مختلف ہو۔ اس لئے عمر کے ساتھ ساتھ تجربے کے اعتبار سے بھی تم ابھی ناپختہ ہو۔ لیکن تجربے کے اعتبار سے چونکہ میں ناپختہ نہیں ہوں اس لئے میں بخوبی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ یہاں آکر تم کیا کچھ محسوس کروگے۔ جب تم یہاں پہنچوگے تو تم بہت خوش ہوگے۔ دہلی کی ہنگامہ بھری زندگی سے نجات پانے اور یہاں کے قدرتی مناظر سے لُطف اندوز ہونے کے خیال سے تم اپنے آپ میں ایک خاص قسم کا نیاپن محسوس کروگے کیسی پُرفضا جگہ ہے۔ شام کے وقت جب تم کھیتوں میں نکلوگے۔ اور سونا لُٹاتی ہوئی شفق، دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیت، اُفق کی لامحدود وُسعت، تمہارے دل و دماغ پر وجد سا طاری کردے گی۔ تمھیں محسُوس ہوگا جیسے جہنم سے نکالکر تمھیں جنت میں داخل کردیا گیا ہے۔ تمھیں ساری کائنات گنگناتی ہوئی محسوس ہوگی۔ پھر یہ تمہارا قلم اس تیزی سے دوڑے گا اور ٹائپ رائٹر پر تمہاری انگلیاں اس تیزی سے ناچیں گی کہ منیجر تمہاری پیٹھ ٹھونکنے پر مجبور ہوجائیگا۔ لیکن

چند ہی روز میں جب اجنبیت کا بھول اُترنے لگے گا۔ اُفق کی لامحدودیت اور شفق کی سُرخیاں دہلی کے اُن گلی کوچوں سے ٹکرائیں گی جہاں تمہارا بچپن گذرا ہے جہاں کی اینٹ اینٹ سے تمہارا جذباتی رشتہ ہے تو جلا وطنی کا تکلیف دہ احساس تمہارے ذہن پر ہتھوڑے برسانے لگے گا تمھیں محسوس ہوگا کہ تم سے صرف کناٹ پلیس چاندنی چوک اور اجمل خاں روڈ کا حُسن ہی نہیں چھینا گیا تمہاری شخصیت کو یکسر فنا کر دیا گیا ہے۔ تم سوچو گے ایسا کیوں ہوا؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایسا نہیں ہونا چاہیئے اور تمہارے دل میں ایسی ایسی خطرناک سکیمیں پیدا ہوں گی کہ میں تمھیں کیا بتاؤں۔ تمہارا جی چاہے گا کہ تم بینک کے منیجر کا سر پھوڑ دو۔ دلباغ رائے کو قتل کر دو۔ اور اپنے گلے میں پھندا ڈال کر چھت کے شہتیر سے لٹک جاؤ۔

چنانچہ یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ تم ہال کمرے میں ہی بیٹھنا۔ مقامی کارخانے کے مزدوروں سے گپ لڑانا۔ تمہارا وقت قدرے آسانی سے کٹ جائیگا۔ ان میں سے چند ایک کو چھوڑ کر باقی کے سب کنوئیں کے مینڈک ہیں۔ دہلی تو کجا اُنھوں نے جبل پور تک نہیں دیکھا۔ تمہاری باتوں میں بڑی دلچسپی لیں گے۔ اور جب تمھیں بابو جی کہہ کر پکاریں گے تو تمہارا دبا گھُٹا برتری کا احساس عود کر آئیگا تمہاری چھاتی پھول جائے گی۔ اور ایک حد تک تمھیں دہلی کا بدل مل جائے گا۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تمھیں دہلی کا بدل مل جائے۔ تم اپنی والدہ کو تیس پنتیس روپے ماہوار بھیج سکو۔ ان تیس پنتیس روپوں کے خُمار میں تمہاری والدہ دن رات لوگوں کے کپڑے سی سکے۔ تمہارے روپے اس کی بوڑھی ہڈیوں میں نئی قوت بھرتے رہیں اور وہ دو تین برس ہی میں اپنی بیاہنے لائق بیٹی کے بوجھ سے

سبکدوش ہونے کے قابل ہو جائے لیکن اس سلسلے میں بھی ایک چیز سے تمھیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ اپنے احساسِ برتری کو جلا دینے کے زعم میں اگر ان مزدوروں سے کبھی قسم کی ہمدردی نہ جتانا۔ وہ نہ جانے کس کے بہکاوے میں آئے ہوئے ہیں۔ مِل مالک کے خلاف زہر اُگلنا اُن کا شیوہ ہے۔ پچاس ساٹھ میں گذر نہ ہو سکنے کا رونا رو کر تمھاری ہمدردی جتینا چاہیں گے۔ لیکن ہوشیار! تمھارا اظہارِ ہمدردی تمھاری ماں کا خمار چھین لے گا۔ تمھاری بہن کے ہاتھوں میں کبھی مہندی نہ رچے گی اور تم ایک غیر معین مُدّت کے لیے جیل میں ڈال دیئے جاؤ گے اگرچہ ان کی اس بات پر کوئی دانا آدمی یقین نہیں لاسکتا کہ آزادی کے بعد ہندوستان کی حکومت کو ہندوستان کا ہر وہ باشندہ جس کی آمدنی سو روپے سے کم ہے، جس کی ماں روٹی کھاتی ہے جس کی بیوی کپڑا پہنتی ہے جس کی بہن بیاہنے کے قابل ہے اور جس کا بچّہ دودھ پیتا ہے، کمیونسٹ دکھائی دینے لگا ہے لیکن یہ تو مجھ ایسا کم عقل انسان بھی جانتا ہے کہ آج ہندوستان میں صرف مزدور، مزارعے ہی کمیونسٹ ہیں کوئی ذی ہوش کلرک کمیونسٹ بننا پسند نہیں کر سکتا۔ کم از کم میں تو اسے گناہِ عظیم سمجھتا ہوں اور میں خوش ہوں کہ مل مالک اور حکومت انھیں بھوکوں رکھتے ہیں جیلوں میں بند کرتے ہیں۔ ان پر گولیاں برساتے ہیں کون نہیں جانتا کہ ہندوستان کی حکومت ان سے کسی قسم کا خوف نہیں کھاتی بلکہ وہ انھیں کڑی سے کڑی سزا دیکر نمک حرامی ایسے نفرین فعل کا خاتمہ چاہتی ہے۔ ان میں دیش بھگتی کے جذبے کو جگانا چاہتی ہے اور چاہتی ہے کہ ہندوستان میں ہر ممکن اور غیر ممکن طریقے سے رام راج قائم کیا جائے۔ چنانچہ اس بات کا تہیّہ کر لو کہ تم ان نمک حراموں

گیتوں کے بول کُند چھُری سے ذبح ہوتے ہوں گے لیکن اصل میں ایسا نہیں ہے۔ اس کی بتیسی صرف ہنیجر کے لفظ پر ہی باہر نکلتی ہے۔ ویسے وہ کافی سنجیدہ مزاج بیرا ہے اور گاتے وقت تو وہ اور بھی سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ پھر تم اس کے صحیح یا غلط تلفظ کی پہچان بھی نہ کر سکو گے کیونکہ وہ ہندوستانی فلموں کے گیت نہیں آسامی لوک گیت گاتا ہے۔ صاحب کو شاپ وہ بھلے ہی کہتا ہو لیکن اس کے دیس کی زبان کے وہ گیت بڑی روانی کے ساتھ اس کی زبان پر سے پھسلتے ہیں۔ ان گیتوں کا مفہوم وہ کبھی بیان نہیں کر سکا۔ اور شاید وہ کسی غیر معمولی مفہوم کے حامل بھی نہ ہوں۔ لیکن ایک بات از خود تم پر واضح ہو جائے گی کہ ان گیتوں میں سر بلند اور برف پوش پہاڑوں کا ذکر ہے۔ مرغزاروں اور ندیوں کا ذکر ہے۔ ناریل اور کیلے کے جھنڈوں اور آکاش سے آسام دیش کی دھرتی پر اُتری ہوئی نٹ کھٹ پریوں کا ذکر ہے اور ونکٹا پرشاد کو اس محویت اور سنجیدگی کے ساتھ گاتے ہوئے دیکھ کر تمھیں محسوس ہوگا کہ ان سر بلند برف پوش پہاڑوں، مرغزاروں، ندیوں، ناریل اور کیلے کے جھنڈوں اور نٹ کھٹ پریوں کو ایک جھلک دیکھنے کے لئے اس منحنی سے انسان کی روح کس قدر بے قرار ہے!

سیٹھ دلباغ رائے کے ہاں ملازم ہوئے اُسے نو برس ہو چکے ہیں۔ ہوٹل کے مستقل مکینوں اور ایک دو روز کے لئے ٹھہرنے والے سوداگروں، ایجنٹوں وغیرہ کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ وہ سیٹھ کے بچّوں کو بھی کھلاتا ہے۔ سیٹھ کا چھوٹا بچہ جو انتہائی غلیظ اور ہر وقت ریں ریں کرتا رہتا ہے اور جسے تمھیں بھی نہایت خوبصورت اور ہنس مکھ کہنا پڑے گا۔ جب ونکٹا پرشاد کی مونچھوں کو (ونکٹا پرشاد

سے ہرگز تعلق نہ بڑھاؤ گے۔ ہاں کمرے میں بیٹھ کر صرف گپ بازی کرو گے، چائے پیو گے اور ریڈیو سنو گے۔

یہاں ہوٹل میں ایک اور شخص بھی ہے جس سے تمہارا سب سے زیادہ واسطہ پڑے گا۔ اور جو کافی حد تک تمہاری دلچسپی کا باعث بن سکتا ہے۔ اس کا نام ونکٹا پرشاد ہے۔ ونکٹا پرشاد ہوٹل کا بٹلر ہے لیکن سب اسے مینجر کہہ کر پکارتے ہیں (یہ خطاب سیٹھ دلباغ رائے کا دیا ہوا ہے) تم جب اُسے مینجر کہہ کر پکارو گے تو اس کی ادھڑ کھابڑ اور تانبے کے تاروں میں جکڑی ہوئی بتیسی والہانہ انداز سے باہر کی طرف لپکے گی۔ اس کی دُور اندر تک دھنسی ہوئی بکری کی مینگنیوں ایسی آنکھیں اُبھرتی اور پھیلتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ اس کے زرد رخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیوں پر نہ جانے کہاں سے سُرخی اُمڈ آئے گی اور "جی شاپ" کے ساتھ وہ تم پر جان تک نچھاور کرنے کو مستعد دکھائی دے گا۔ لیکن خدانخواستہ اگر تم نے پہلے روز ہی اُسے بیرا کہہ دیا اور آئندہ بھی اس میں ترمیم نہ کی تو وہ تم سے سخت متنفر ہو جائیگا تمہارے لاکھ چلّانے پر کان نہ دھرے گا۔ تمہارے نہانے کے لئے وقت پر ٹب میں پانی نہ ڈالے گا۔ تمہیں کبھی تازہ داتن لاکر نہ دے گا۔ اور اس طرح تمہیں سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ تمہیں اس کی مزیدار باتیں سُننے کا موقع نہ مل سکے گا۔ اس سے ذرا سی ہمدردی جتاکر اور کسی عورت کا ذرا سا ذکر چھیڑ کر مزیدار باتوں کے علاوہ تم اس سے مزیدار گیت بھی سُن سکتے ہو۔ گیت! یقیناً تمہارے کان کھڑے ہو گئے ہوں گے۔ اور تمہیں تعجب ہو رہا ہوگا کہ جو شخص صاحب کو شاپ کہتا ہے اور جس کی بتیسی کے اُکھڑنے کا ہر آن اندیشہ رہتا ہے وہ بھلا گا کیونکر سکتا ہے؟

کے بڑی بڑی مونچھیں ہیں اور شاید منیجر کا خطاب پانے میں ان مونچھوں کا بھی کچھ حصہ ہے)
پکڑ کر لٹکنے کی کوشش کرتا ہے تو ونکٹا پرشاد رو آنسو سا ہو کر اسے گود سے اتار دینا چاہتا
ہے لیکن وہ اسے اتارتا نہیں۔ کیونکہ اس نظارے سے محظوظ ہونے اور واہ واہ کا
نعرہ بلند کرنے والے دلباغ رائے کی موجودگی اُسے اپنی مونچھوں اور چہرے کو نُچوانے
پہ مجبُور کر دیتی ہے۔ ونکٹا پرشاد کمیونسٹ تو نہیں ہے۔ لیکن ان کی صحبت سے اس میں
بھی نمک حرامی کا زہر سرایت کر چکا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کی مجبُوریاں صرف مونچھوں
کے بال اکھڑوانے اور چہرہ نچوانے تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ اُسے ہر لحظہ کئی کئی مجبوریوں
کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ بیرا ہونے پر منیجر
کہلوانے، دُھلے ہوئے کپڑے پہننے، مونچھوں پہ بلا ناغہ تیل چپڑنے اور چولھا جھونکنے
کے بجائے معزز لوگوں یعنی ہم کلرکوں، بیمہ کمپنی کے ایجنٹوں وغیرہ سے براہِ راست گفتگو
کر سکنے کے باوجود وہ خود کو حقیر کیوں سمجھتا ہے؟ اپنے ان داتا دلباغ رائے سے اُسے
خدا واسطے کا بیر کیوں ہے؟

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بات تھی اس کے تمہاری دلچسپی کا باعث بننے کی۔ تو
دوست اگر تم چاہو تو بائی جی کے متعلق اس سے گندی سے گندی گفتگو کر سکتے ہو۔

اب رہی یہ بات کہ میں نے اس جگہ کو پسند کیا ہے یا نہیں ——؟ مجھے
افسوس ہے کہ اس سلسلے میں تمھیں تسلی بخش جواب نہ مل سکے گا۔ در اصل میری پسند
اور تمھاری پسند میں بہت بڑا فرق ہے۔ میں ایک تجربہ کار اور کہنہ مشق کلرک ہوں۔
گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے میں نے، اور تم —— تم ابھی نو وارد اور نوآموز ہو۔
دُنیا اتنی خوبصورت نہیں ہے میری جان! جتنی تم سمجھتے ہو۔ اور چونکہ میں نے اس راز

کو پالیا ہے اس نے اب مجھے دُنیا کی خوبصورتی اور بدصورتی، یہاں کی پسند اور ناپسند سے چنداں لگاؤ نہیں رہا جب میں جانتا ہوں کہ مجھے یہاں بہرصورت رہنا ہے بہرصورت ایک سو روپے میں گذر کرنا ہے تو اندرسین کی طرح رونے اور جگل کشور کی طرح قسمت اور حکومت پر لعنتیں بھیجنے اور ان نمک حرام مزدوروں کی طرح واویلا مچانے سے حاصل! دُنیا میں رہنے کے لئے دُنیا سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑتا ہے اور جو بے وقوف بزرگوں کی اس بات کو نہیں سمجھتا یا نہیں مانتا وہ عمر بھر بھٹکتا رہتا ہے۔ اسے کبھی اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔

میں بالکل مطمئن ہوں، ایسا بھی نہیں ہے۔ دراصل میں اطمینان اور بے اطمینانی کے درمیان کھڑا ہوں۔ لیکن چونکہ میرا رُخ شروع ہی سے اطمینان کی طرف رہا ہے اور میں ہمیشہ سے بزرگوں کے کہے پر چلنے کی کوشش کرتا آیا ہوں اس لئے بے اطمینانی سے میرے حواس مختل نہیں ہوتے۔ بارہا مجھ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے، اپنی خواہش کے خلاف کام کرنے کی مجبوری سے میرے دل میں بڑے خوفناک ارادوں نے جنم لیا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آج بھی میں اپنی خواہش کے خلاف ہی حالات سے سمجھوتہ کئے ہوئے ہوں۔ لیکن آخر تجربہ بھی کوئی چیز ہے اور پھر بزرگوں کا تجربہ ....

میرا خیال ہے تم بھی بزرگوں کے تجربے پر عمل کرنے کی کوشش کرو گے۔

آہا! کیسا عجیب نظارہ ہے۔ اندرسین کی چھاتی پر ہیر کھلی پڑی ہے اور وہ سو گیا ہے جگل کشور کے سرہانے اس کی بیوی اور لڑکی مسکرا رہی ہیں۔ لیکن وہ بھی سو گیا ہے۔ کمرے میں مکمل سکوت ہے۔ غالباً نیجرا اور میرے بھی ہال کمرے

کی تخ بستہ ہیز پر سو چکے ہوں گے۔ کیونکہ نیچے سے کوئی آواز نہیں آرہی۔ نیند میں اندرسین اور جگل کشور کے چہرے عجیب وغریب دکھائی دے رہے ہیں۔ کون جانے اس وقت یہ دونوں کہاں پہنچے ہوتے ہیں۔ شاید اندرسین اپنی محبوبہ کے بنگلے کے لان میں کھڑا کہہ رہا ہوگا — نہیں، تمھاری جُدائی میں میں مروں گا نہیں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے مرجانے سے سماج کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تمھارا لکھ پتی باپ تمھاری شادی کروڑپتی رگھبر دیال کے اوباش بیٹے سے ضرور کرے گا۔ میری زندگی یا موت کی اہمیت ہی کیا ہے۔ تم جاؤ اور کروڑپتی رگھبر دیال کے بیٹے کے پلنگ کی زینت بنو۔ تمھارے باپ کا داماد ایک نوّے روپے کا کلرک نہیں بن سکتا۔ اور جگل کشور اپنی بیوی کی پُرنم آنکھوں کی طرف دیکھتا ہوا، گود میں لی ہوئی بیٹی کا ماتھا چُوم رہا ہوگا اور کہہ رہا ہوگا چار مہینے ہی کی تو بات ہے چار مہینے کے بعد میں پورے پندرہ دن کی چھٹی لے کر آؤں گا۔ چار مہینے تو یوں پلک جھپکنے میں گذر جاتے ہیں۔ روتی ہے، پگلی! شاید یہ رات بھر اسی طرح خواب دیکھتے رہیں گے۔ اندرسین اپنی محبُوبہ سے اور جگل کشور اپنی بیوی سے اسی طرح خوابوں میں ملتے رہیں گے — اور اب میں تمھیں آخری نصیحت یہ کروں گا کہ تم حتی الوسع اندرسین اور جگل کشور سے پہلے سونے کی کوشش کیا کرنا۔ یہ نہایت ضروری ہے اور اس کا مجھے تلخ تجربہ ہے میں تمھیں بتاؤں کہ جب کبھی میں انھیں اس طرح سوئے ہوئے دیکھتا ہوں تو میری نیند حرام ہوجاتی ہے۔ باوجودیکہ بزرگوں کی باتیں، اُن کے اور اپنے تجربوں کو میں ہروقت ذہن میں رکھتا ہوں۔ اور میں نے حالات سے سمجھوتہ کرنا بھی سیکھ لیا ہے لیکن پھر بھی میں بھٹک جاتا ہوں اس وقت غیر اختیاری طور سے مجھے ایسا محسوس

ہونے لگتا ہے جیسے اندرسین کی بند آنکھیں آہستہ آہستہ کھل رہی ہیں۔ اور اُن کے کونوں سے ایک چیرتی ہوئی نگاہ میرے دل میں پیوست ہوتی جارہی ہے اور نگاہوں ہی نگاہوں میں وہ مجھ سے کہہ رہا ہے ___ ہماری زندگی بے وقعت ہے۔ ہماری موت بے وقعت ہے۔ ہم بے وقعت انسان ہیں۔ اور جنگل کشور کے نتھنوں سے نکلتا ہوا سانس سانپ کی پھنکار بن جاتا ہے۔ ہم کولھو کے بیل ہیں۔ ہم بھیڑیں ہیں۔ اور میں کچھ یونہی اوٹ پٹانگ خیالات میں اُلجھ جاتا ہوں۔ کیا واقعی ہم بے وقعت انسان ہیں۔ کولھو کے بیل اور بھیڑیں ہیں؟ ہمیں یہاں بہر صورت کیوں رہنا ہے؟۔ بہر صورت ایک سو روپے میں گذر کیوں کرنا ہے؟ مزدور اگر مل مالک کے خلاف زہر اُگلتے ہیں تو کیا وہ حق بجانب نہیں؟ کیا نمک حلالی کا یہی تقاضہ ہے کہ دن رات کی سر توڑ محنت کے باوجود عمر بھر پھٹے حال رہا جائے۔ بھر پیٹ روٹی نصیب نہ ہو۔ ونکٹا پرشاد کو منیجر کا خطاب دیکر اس سے دوگنا چوگنا کام کیوں لیا جاتا ہے میرے ماں بہن کی گالیاں اور تھپیڑ کیوں سہتے ہیں۔ اس ناقابلِ برداشت زندگی سے سمجھوتہ کیوں ___ کیوں؟

اور میں خود کو ایک ایسے جمِ غفیر میں گھرا پاتا ہوں جس میں ہزاروں اندرسین ہیر گنگنا رہے ہوتے ہیں۔ اور رو رہے ہوتے ہیں جس میں لاکھوں جنگل کشور روز افزوں گرانی پر بحث کرتے ہوئے قسمت پر پھٹکاریں بھیج رہے ہوتے ہیں جس میں کروڑوں مزدور ___ میں تمھیں کیا بتاؤں کیسی ہیجانی کیفیت ہوتی ہے وہ اور اس وقت میں کیا کچھ سوچتا چلا جاتا ہوں۔ میرا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے اور میں پاگلوں کیطرح بڑبڑانے لگتا ہوں ___ ہمیں جیلوں میں ڈالدو ___ ہمیں گولی ماردو.....

لیکن واہ ری مارٹل! مارٹل نیند لانے کی تیر بہدف دوا ہے۔ ایسے وقت میں خوب آڑے آتی ہے۔ پچھلے پانچ برس سے میں متواتر اس کا استعمال کر رہا ہوں کیونکہ جہاں کہیں بھی میری تبدیلی ہوتی ہے۔ اندرسین، جگل کشور، ونکٹا پرشاد اور مزدور پہلے ہی سے وہاں موجود ہوتے ہیں۔ بہتر ہوگا اگر تم ابھی سے اس کی عادت ڈال لو۔ یہ ہر شہر میں ہر دوا فروش سے مل سکتی ہے۔ البتہ نقالوں سے بچنے کے لئے لیبل پر MADE IN U.S.A. ضرور پڑھ لینا۔

●

تشنۂ تکمیل

میرا یہ خط تم تک پہنچے گا، اس کی مجھے قطعی امید نہیں ہیں. بخوبی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ تم ایسی عورتیں اپنا صحیح پتہ بتانے میں ہمیشہ چالاکی سے کام لیتی ہیں. لیکن اپنے دل کی انتہائی کشاکش کو قدرے کم کرنے کے لئے کہ جب سے ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہیں اور تمہارے ہونٹ، تمہارے رُخسار، تمہارے جسم کا ایک ایک عضو میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتا ہوا میری تمام تر توجہ اپنی طرف منعطف کئے رہتا ہے. میں نے تمھیں خط لکھنے کا بہانہ ڈھونڈا ہے. گو یہ ایک احمقانہ فعل ہوگا اگر میں فرض کرنے لگوں کہ میرا یہ خط تمھیں مل جائیگا اور تم اس کا جواب دینے کی زحمت بھی گوارا کروگی. لیکن میں اس طرف سے بھی تمہارا دل صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے تمہارے جواب کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے.

اب چونکہ ہماری ملاقات ایک غیر یقینی سا امر ہے. تمہارا جواب آنے یا نہ

آنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑ سکتا۔ لیکن میری پریشانیوں میں کچھ فرق پڑ سکے،
آج میں تمہاری وہ خوش فہمیاں وہ بے بنیاد سی باتیں تم پر واضح کر دوں گا کہ جن
کی آڑ لیکر تم نے مجھے اپنی طرف راغب کرنا چاہا تھا اگرچہ وہ سب کہتے ہوئے
تم انتہائی طور پر سنجیدہ ہو جاتی تھیں۔ لیکن تم اس قدر کچی بھی تو نہ تھیں کہ اس قسم کی
موہوم باتیں تمہارے دل کی گہرائیوں سے نکل سکتیں۔ پھر کیا اس کا بھی وہی ایک ہی
پس منظر نہیں ہو سکتا کہ تم سنجیدہ ہو ہی نہیں سکتیں۔ تم، جو میری کسی بات کا جواب
دینے سے پیشتر یونہی طلوع یا غروب ہوتے ہوئے سورج کا نظارہ کرنا شروع
کر دیتی تھیں یا پھر بیٹھے بیٹھے خواہ مخواہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو جاتی تھیں۔ میں
ان باتوں کی حقیقت آج تم پر آشکارا کر دینا چاہتا ہوں۔ میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں
کہ تمہاری اس قسم کی حرکات میرے دل میں تمہارے متعلق کبھی گہرائی پیدا کرنے
کا موجب نہ بن سکی تھیں بلکہ ایسا نہ کرتے ہوئے اگر تم صحیح طور پر جو کچھ کہ تم تھیں میرے
سامنے رہتیں تو شاید تمہاری شخصیت مجھ پر بُری طرح اثر انداز ہو جاتی ہیں تمہارے
ہی کام کی کوئی شئے بن جاتا۔ لیکن تم نے تو ہمیشہ اپنے آپ کو ارفع دکھانے کی کوشش
کی اور یہ محض حُسنِ اتفاق تھا کہ تم میں کچھ دکھانے کی بھی صلاحیت موجود نہ تھی۔

اس فربہ اور گنجے سیٹھ کی بیباک گندی حرکتوں کا ذکر کر چکنے کے بعد کہ جس کی
تم داشتہ تھیں اور جس نے کبھی ایک رات بھی تمھیں علیحدہ چارپائی پر نہ سونے دیا تھا۔
تم نے ہمیشہ مجھ سے یہی سوال کیا ـــ کہ میں تمہارے ہونٹ کیوں چُومنا چاہتا ہوں اس
اس وقت بھی اگر یہ میرا خط تمھیں مل گیا ہو گا تو شاید تم یہی سوچ رہی ہو گی کہ آخر
تمہارے ہونٹ، تمہارے رخسار، تمہارے جسم کے دوسرے اعضا میری پریشانیوں کا

باعث کیوں بنے ہوئے ہیں جبکہ تمھاری باتوں، تمھارے وجود کے متعلق میں کچھ نہیں سوچتا
ــــــ لیکن نہیں، اس وقت تو تم خوش ہو رہی ہوگی کہ اپنی چالاکیوں اور ریاکاریوں سے
تم نے ایک ایسے شخص کو تذبذب میں ڈال دیا ہے جو تمھارے ساتھ ہمیشہ ایسا برتاؤ
کرتا رہا کہ جس کی تم مستحق نہ تھیں۔

اگرچہ ایک حد تک یہ درست بھی ہے کہ تم اپنے ارادے میں کامیاب ہو چکی ہو،
لیکن میں بالکل ہی احمق تھا یہ بھی کچھ اتنا درست نہیں۔ تم کہہ سکتی ہو کہ اگر یہ بات نہ تھی
تو میرے ٹل جانے میں کونسا راز پنہاں تھا تو اس کا جواب اس سے مختلف اور کچھ نہیں
ہو سکتا کہ میں چاہتا تھا کسی دن تم خود ہی اپنے ہونٹ، اپنے رخسار، اپنا سب کچھ
میرے حوالے کر دو۔ مجھے اُمید تھی کہ ایک دن ضرور ایسا ہوگا۔ کچھ یہی سبب تھا کہ
میں نے ہمیشہ ایک طرح کی طفلانہ سادگی سے تمھارے ان سوانگ کا خیر مقدم کیا۔ تم
اگر اس سمے ذرا دیر کے لئے بھی اپنی خوبصورتی کے شدید احساس کو بھول کر میری اس
وقت کی باتوں کا تجزیہ کرتیں تو بلاشبہ میرا پول بھی کھُل جاتا لیکن تمھیں تو اپنے حُسن
پر اس قدر ناز تھا کہ تمھارے خیال میں جس وقت بھی میں تمھارے سامنے آتا تھا میں
مبہُوت ہو کر رہ جاتا تھا۔ کاش کہ تم سمجھ سکتیں کہ تمھاری معلومات کس قدر محدود تھیں
جب مجھے تم سے باتیں کرنے، تمھارے قریب ہونے اور دست درازی
سے کچھ ہی ادھر کی حد تک دل لگی کرنے کی اجازت تھی تو تمھیں دیکھ کر کم از کم میں مبہُوت
تو نہ ہو سکتا تھا۔ میں ان نفسیاتی گہرائیوں سے منحرف نہیں جو میرے اس سوال پہ
کہ جب تم میرے سامنے نہیں ہوتیں، تمھارا وجود مجھے انتہائی نفرت انگیز معلوم ہوتا
ہے تم ایک پُر اسرار سی مسکراہٹ کے ساتھ یہ کہا کرتی تھیں کہ اس وقت تمھارے

ہونٹ، تمہارے رُخسار، تمہارا جسم میری آنکھوں کے سامنے نہیں ہوتا. لیکن کیا کبھی تم نے یہ بھی غور کیا تھا کہ آخر میں یہ سوال کرتا ہی کیوں ہوں اور پھر اسے بار بار دہرانے سے مجھے کیا حاصل ہوتا ہے؟

ازبسکہ تم پہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ مجھے سمجھنے میں تم غلطی کرتی رہی ہو بلکہ میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ تم کمال خود غرضی میں مبتلا تھیں۔ اس پہاڑی مقام پہ تم کسی کے ہمراہ آئی ہو، تم نے تو اس بات کو بھی راز میں رکھنا چاہا تھا لیکن تمھیں کیا معلوم کہ میں نے تو اس پہلی ملاقات ہی میں بھانپ لیا تھا جب کھلن مرگ کے میدان میں چشمے کے قریب کھڑی تم ایک کشمیری ہاتو کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں کہ تم کس قسم کی عورت ہو۔ تم چونکہ ایک خاص قسم کی عورت ہو اس لئے عام قسم کی عورت کے ساتھ پہلی مرتبہ ہمکلام ہوتے ہوئے آدمی کس طرح پیش آتا ہے۔ یہ بات تمھاری سمجھ سے بالاتر ہے تمھیں یاد ہو گا کہ اس وقت بلا کسی جھجک میں بالکل تمھارے قریب آکھڑا ہوا تھا اور پھر جب اس ہاتو کی کسی بات پہ تم ہنسنے لگی تھیں تو میں بھی خواہ مخواہ تمھاری ہنسی میں شریک ہو گیا تھا، تم نہیں سمجھ سکتیں کہ اس وقت اگر تمھاری جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو میں کبھی یہ جرأت نہ کر پاتا۔ اب پھر تم کہہ سکتی ہو کہ آخر مجھے یہ پہچان کیوں کر ہوئی۔ بارش نے تمھاری تمام خود نمائی کو کہ جس سے شاید کچھ اندازہ ہو سکتا، بری طرح دھو ڈالا تھا۔ اور تو اور اپنے ہونٹوں پہ لگائی ہوئی سرخی بھی تم پونچھ چکی تھیں لیکن تم نہیں جانتیں کہ تمھاری طرح کی عورتوں کے چہروں کا خاصہ جو مبہم سی لاپرواہی اور پر تصنع لاتعلقی ہوتا ہے اُسے تو پردہ بھی نہیں چھپا سکتا۔ چہرہ ڈھانپ لینے سے جسم کی حرکات و سکنات اپنا آپ ظاہر کر دیتی ہیں۔ پھر تم تو باتیں بھی کر رہی

تھیں ۔ ایک نادار کشمیری ہاتو کے ساتھ عجیب عجیب بے معنی باتیں اور ہنسی اور مذاق ۔
پھر تم نے میرے ساتھ باتیں کرنا شروع کر دیں ۔ بلا وجہ، بے مطلب ۔ بھلا تمھیں اس سے کیا سروکار ہو سکتا تھا کہ میں کشمیر ہی کا باشندہ ہوں یا تمھاری طرح کسی دُور دیس سے سیر و تفریح کی خاطر آیا ہوا ہوں ۔ میں کشمیری دِکھائی نہیں دیتا پنجابی معلوم ہوتا ہوں ۔ یا میں کیا کر سکتا تھا اگر بارش نے تمھارے کپڑے بُری طرح ستیاناس کر دیئے تھے اور اپنے ہوٹل میں پہنچ کر سب سے پہلا کام تم یہ کرو گی کہ تم چائے پیو گی ۔
اور جب پھسلن ہو جانے کی وجہ سے ہم گھوڑوں پر سوار ہونے کی بجائے پیدل ہی نیچے گلمرگ کی طرف اُتر رہے تھے تو اس عرصے تک تم اور بھی زیادہ کھُل چکی تھیں ۔ میں اپنے دل کی کہ جو اس وقت اس کی حالت ہو رہی تھی بیان کرنے سے معذور ہوں لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ تمھاری باتوں اور تمھارے اندازِ گفتگو سے خواہ مخواہ میرے دل میں یہ چاہت پیدا ہو گئی تھی کہ اگر تمھاری طرف سے اس طرز کی ذرا سی ڈھیل ہو جائے تو دوسرے ہی لمحے میں تمھیں اپنی آغوش میں کھینچ لوں تمھارے ہونٹ چُومنے لگوں اور کہوں کہ پیاری، نیچے گلمرگ میں جا کر کیا کریں گے آؤ تھوڑی دیر کے لئے ہم عشق کریں ۔
حالانکہ تمھیں بارش ہو جانے پر ملال تھا لیکن تم کہہ رہی تھیں کہ کوئی پروا نہیں وہ تو میں کہہ ہی چکا ہوں کہ تم ایسی عورتوں کو کسی حالت میں بھی کوئی پرواہ نہیں ہوتی ۔
اس وقت بھی اگر پھر بوندا باندی شروع ہو جانے سے میں نے اپنا برساتی کوٹ اُتار کر تمھیں نہ دیدیا ہوتا یا تم اُسے قبول نہ کرتیں اور اس کے باوجود اس دیودار کے جھنڈ میں کہ جہاں سستانے کے لئے ہم رُک گئے تھے میں بلا اجازت تمھارے ہونٹ چوم لیتا۔

تو تم یہی کہتیں کہ کوئی پرواہ نہیں ۔ کچھ تمہاری باتوں اور اداؤں تک ہی محدود نہ
تھا ۔ تمہارے ہونٹوں کا بیساختہ پن بھی میرے دل کو بُری طرح جھنجوڑے دے رہا
تھا ۔ تمہارے کل بدن ہی میں ایک لطیف ترغیب بسی ہوئی تھی ۔ میں تمہارے ہونٹوں
کی کئی جلوہ افروز کیفیتیں دیکھ چکا ہوں ۔ میں نے اس وقت بھی نہایت غور سے اُنھیں
دیکھا ہے جب تم اپنے پورے ہیک آپ میں ہوا کرتی تھیں ۔ اور تمہارے ہونٹوں
پہ بیر بہوٹی اور پنجتارے کے پھولوں سی گہری سُرخی، رسیلاپن اور چمک پیدا ہو اُٹھتی
تھی ۔ لیکن تمہارے اس وقت کے ہونٹ ، میں سچ کہتا ہوں ، میں آج بھی ان کیلئے
کوئی تشبیہہ ڈھونڈنے سے قاصر ہوں اگر شیشے میں لچک پیدا ہو سکتی اور ٹھیک اُسی
طرح وہ تراشا بھی جا سکتا تو شاید میں یہ کہنے کے قابل ہوتا کہ ان شیشے کی دو لچکیلی
پھانکوں میں تازہ پہاڑی شہد کچھ اس طرح بھر دیا گیا تھا کہ کسی چیز کے لمس ہی سے
وہ رسنا شروع کر دیتیں ۔ اس پہ تمہارے ہونٹوں کی تو کچھ ساخت ہی ایسی ہے کہ
کسی وقت بھی اُنھیں دیکھ کر یہی دھوکا ہو سکتا ہے کہ اُنھیں چُومنے کے لئے پیش کیا جا رہا
ہے ۔ لیکن نہ میں نے اُنھیں چُوسنے کی کوشش کی نہ تم نے اُنھیں پیش کیا ۔۔۔ تم میں
اگر تصوّر کرنے کا کچھ مادّہ ہے تو ذرا اُن لمحات کا تصوّر کرو جب بادلوں ، درختوں اور
جھاڑیوں میں گھری ہوئی اس جگہ پہ ہم کھڑے تھے ۔ دُھند نما بادلوں نے ہم سے کچھ ہی
ہاتھ پرے کی دنیا کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا ۔ فضا میں ایک خوابیدہ سی کیفیت
گھلی ہوئی تھی اور سوائے میرے اور تمہارے کوئی وہاں موجود نہ تھا ۔ ہر چند کہ تمہاری
نیم باز آنکھیں ، تمہارے ہونٹوں کا والہانہ پن ، تمہاری بھیگی ہوئی آبی ساڑھی میں سے
پھوٹ پھوٹ پڑتے ہوئے اعضا ، اور خود قدرت بھی مجھے کسی وحشیانہ فعل پر اکسا رہی

تھی لیکن میں نے کوئی بھی ایسا فعل نہیں کیا جسے تہذیب کے دائرے سے باہر کہا جا سکتا ہو۔ اس بات سے قطع نظر کہ تم کیا ہوا اور اس پر شکوہ فضا، اس تنہائی میں بھی تمھارے دل میں کوئی جذبہ بیدار نہیں ہو سکتا ہیں اسی کش مکش سے حظ اٹھاتا رہا کہ شاید ابھی کچھ دیر کے بعد صحیح معنوں میں، جس طرح کہ ہونا چاہیئے تھا تم اس سحر طراز منظر کی اہمیت کا اعتراف کرنے لگو گی لیکن تم تو باتیں ہی کرتی رہیں وہی بے سر و پا، فضول باتیں۔ بارش کو بھی آج ہی ہونا ہے۔ ہوٹل میں نوکر تمھارا انتظار کر رہے ہوں گے تمھارے دو نوکر ہیں لیکن مالکوں سے بھی زیادہ رعب گانٹھتے ہیں۔

آج، جبکہ سوتے جاگتے، غیر محسوس طور پر میں تمھیں اپنی باہوں کے حلقے میں لے لیتا ہوں۔ تمھیں بھینچا کرتا ہوں۔ تمھارے ہونٹ چومتا ہوں تو میرے دل میں یہ کسک سو سو کر جاگ اٹھتی ہے کہ اس دن اگر تمھیں ایسا ہی کرنا تھا تو جو کچھ میں نے کیا مجھے نہ کرنا چاہیئے تھا۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ مخالف صنف کی باتیں یاد آنے کی بجائے رہ رہ کر اس کا جسم ہی نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ یا زیادہ واضح ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ عورت کی یاد اس کے جسم کی دل کشی اور اس کے شباب کی رعنائی ہی سے وابستہ ہے۔ ایک عورت اور پھر تم ایسی عورت کے سامنے اس قسم کی باتیں کرنا حماقت ہوگی۔ لیکن مجھے تو ان کوڑ مغز عاشقوں کا نظریہ سرے ہی سے بے معنی معلوم ہوتا ہے جو کسی عورت کے ساتھ محبت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی محبت جسمانی نہیں! رُوحانی ہے۔ ان کی محبوبہ ان کے نزدیک رہے یا نگاہوں سے اوجھل انھیں اس کی مطلق پروا نہیں۔ وہ اس کے تصور ہی کے سہارے جی سکتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں آخر وہ تصور کیا بلا ہے؟ اپنی محبوبہ کے جسم سے اگر انھیں کوئی سروکار نہ تھا تو

اُن کا یہ تعلق کیونکر قائم ہوا اور پھر تصوّر ـــــــــــ اب اُنھیں تصور کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے۔ خیر یہ ایک لمبی بحث ہے اور میں عبث اس میں اُلجھنا نہیں چاہتا۔ میں اس پہلی ملاقات کا ذکر کر رہا تھا جس میں تم نے کچھ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ محض دو نوکروں کی معیت ہی میں تم وہاں آئی تھی اور چونکہ وہ نوکر مالکوں سے بھی زیادہ رعب گانٹھتے تھے اس لئے گاف کورس کے میدان کے نزدیک ہی سے تم نے یہ کہہ کر کہ اب تم اکیلی چلی جاؤ گی مجھ سے جُدا ہو جانا مناسب سمجھا۔

تمھاری خوشنودی کے لئے اب میں ان واقعات کا بھی ذکر کروں گا کہ جن کی بدولت تم مجھ سے اپنے اندر کی عورت کی عظمت کا اعتراف کرانا چاہتی تھیں لیکن اس سے پیشتر میں اس دن کے بعد کی دوسری ملاقات کو بیان کرنا چاہتا ہوں کہ جس میں تم نے خود بخود ہی جو کچھ کہ تم تھیں، مجھ پر عیاں کر دیا تھا۔ میں اکثر حیران ہو جاتا ہوں کہ جب معمولی ہی بے توجہی سے کام لیکر تم بخوبی اپنا آپ چھپا سکتی تھیں اور جب کہ بعد میں تم خود ہی کہا کرتی تھیں کہ تمھیں اس راز کا افشا ہونا پسند نہ تھا، تم نے ایسا کیوں کیا؟ "اس وقت میں نے مناسب نہ سمجھا؟" یہ بھی تمھارے بعد ہی کے الفاظ تھے لیکن میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر تم نے اپنی زندگی میں کیا کچھ غیر مناسب نہیں کیا جو اس وقت تمھیں کچھ مناسب کرنے کا خیال پیدا ہو آیا تھا۔

وہ سرکلر روڈ تھی جہاں اچانک ہی ہمارا آمنا سامنا ہو گیا تھا اور تم اپنے ساتھی، اپنے سیٹھ کی موجودگی کے باوجود کمال بے باکانہ طور پر مجھ سے ہمکلام ہو گئی تھیں وہ غصیلی، حیرت بھری نگاہوں سے تمھاری طرف دیکھ رہا تھا اور تم حیرت انگیز پیرائے میں مجھ سے گلہ کر رہی تھیں کہ اس دن کے بعد میں تم سے دوبارہ کیوں نہیں ملا۔

کس قدر عجیب، پُر لطف ملاقات تھی۔ میں تو خود تم سے ملنے کے لئے بیقرار تھا۔ اور اگر اُس دن تم نے اپنی جائے رہائش کا پتہ مجھے بتادیا ہوتا یا جاتے وقت تم اس بے اعتنائی سے پیش نہ آتیں تو یقیناً کئی مرتبہ میں تم سے ملنے کی کوشش کر چکا ہوتا۔ اس وقت وہاں سیلانیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور آتی جاتی سینکڑوں نگاہیں تمھیں گھور رہی تھیں۔ میں تمھیں کیونکر بتاؤں کہ اس سے میری روح پر ایک نا قابلِ بیان سا نشہ طاری ہوگیا تھا۔ دیوانگی کی حد تک برتری کا احساس کہ میں راہ چلتے ہوئے لوگوں سے چلا چلا کر کہنے لگوں دیکھو، اس بُتِ سیمیں، اس ہوشرُبا حسینہ کی طرف جسے تم للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے ہو میری جُدائی کس قدر شاق گذر رہی ہے۔ لیکن وہ نشہ ہرن ہوتے دیر نہ لگی جب تھوڑی دیر کے بعد تم مجھ سے جُدا ہو کر اس بھینسے کے ساتھ چہل قدمی کی غرض سے آگے نکل گئیں۔ بھینسا! میں تمھارے اس سیٹھ کے لئے اس سے بہتر نام تجویز کرنے سے معذور ہوں۔ اس رومان انگیز سڑک پر، اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی ہوئی خود تم کس قدر بھدی معلوم ہو رہی تھیں۔ یہ ایک گھٹیا اور پست درجے کی مثال ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ کھانڈ کی بوری کو کتا چمٹ گیا تھا۔ لیکن جس طرح تمھارے کہنے کے مُطابق بھیڑیئے اور کتے شاید تم سے کبھی علیٰحدہ نہ ہوں گے۔ اس کی زندگی سے بھی کھانڈ کی بوریاں جُدا نہیں کی جاسکتیں۔ یہ تشبیہہ بھی مجھے کچھ اسی وجہ سے سُوجھی ہے کہ اس کے کاروبار کا ایک اہم جزو کھانڈ کی تجارت بھی تھا۔

ایک پختہ ریاکار کی طرح میری اس بات پر تم مسکرا دو گی اور شاید یہ بھی سوچنے لگو کہ میں جو اس قسم کی باتیں بنا رہا ہوں ان کا تعلق بھی محض میرے اس احساس برتری ہی سے ہے۔ اور شاید یہ جھوٹ بھی نہیں کیونکہ اگر اس وقت تم نے مجھے دوسرے دن

میرے ہی ہوٹل میں آکر ملنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا اور ہونے والی ملاقات کا تصوّر میرے سوچنے سمجھنے کی قوت کے ایک بہت بڑے حصّے پر غالب نہ آجاتا تو ممکن تھا پھر اگر اسی طرح کسی بھی مقام پر ہماری ملاقات ہو جاتی تو تمھارے نظریئے کے مُطابق مجھے بھی تمھیں کتّوں اور بھیڑیوں ہی میں شمار کرنا پڑتا۔ لیکن تم نے آخری وقت تک یہی محسوس کیا ہوگا کہ میں تمھیں، تمھارے خیالات، تمھارے جذبات کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں اس میں تو مزید تشریح کی ضرورت نہیں کہ تم کبھی اصلیت بیان کرتی تھیں نہ میں جو کچھ کہتا تھا اس میں صداقت ہوتی تھی لیکن میں نے تم پر کبھی حقیقت کو ظاہر نہ ہونے دیا تھا۔ تمھاری نا سمجھی کا ایک باعث تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم نے مجھے عقلمند کہنے کا حربہ لیکر اور یہ کہہ کہہ کر کہ تم نے مجھے دوسرے انسانوں سے قطعی مختلف پایا ہے، مجھے لاچار کر دیا تھا کہ تمھارے خیال کے مُطابق میں عقلمند اور مختلف ہی بنا رہوں۔ مگر آج مجھے اپنے کیئے پر ندامت ہے اگر واقعی میں سمجھدار اور مختلف ہوتا تو آج مجھے یہ خط لکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ کیا تم مجھے بیوقوف نہ خیال کرتی تھیں۔ آخر میں بھی تو ایک مرد تھا۔ پھر تمھارے اس بڈھے مکروہ سیٹھ سے کہیں کم عمر اور خوش شکل۔ بیشک وہ تمھیں بیش قیمت ملبوسات اور زیور عنایت کر سکتا تھا تم اس کی دولت کے بل بُوتے پر عطر میں نہا سکتی تھیں۔ لیکن ان چیزوں سے ہٹ کر بھی تو کوئی شئے ہے جس میں مقابلاً چاہے کچھ کمی واقع ہو لیکن جو اپنی جگہ نامکمل نہیں۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس کا تو کوئی جواز ہی نہیں ہو سکتا تم اس مقدس جذبے سے متعارف نہیں ہوئیں جو ایک جوان عورت اور جوان مرد کے سانس گھُل مل جانے سے پیدا ہوتا ہے، میں سچ کہتا ہوں، اس کے قیاس ہی کے بالمقابل

دُنیا بھر کی آسائشیں، کسی قارون کا خزانہ بھی ہیچ ہے۔ شاید میں تمہیں وہ انمول تحفہ پیش کر سکتا کہ جس کی نایابی سے تمہارے اندر کی عورت تمہیں "تھکا ہوا" کہنے پر مجبور کر دیتی تھی ——— اندر کی عورت، ہاں، تمہاری خوشنودی کے لئے مجھے اس کا بھی ذکر کرنا ہوگا۔ اگرچہ اس کے اب تک زندہ رہ سکنے کا کوئی امکان نہیں، تم ایسی نمائش پرست اور آوارہ صفت عورتیں اندر اور باہر دونوں طرف سے ایک ہی جیسا رہنا پسند کرتی ہیں۔ شروع شروع میں اگر تمہارے اندر کی کوئی شئے تمہارے ذہن کو تمہارے دل کو چھونے کی کوشش کرتی ہے تو تم خود اپنے ہاتھوں اس کا گلا گھونٹ دیتی ہو لیکن پھر بھی میں فریب میں مُبتلا ہونا پسند کروں گا کہ تمہارے اندر کی عورت زندہ تھی اور جو کچھ کہ وہ تم سے کہلواتی تھی ان باتوں کے پیشِ نظر، بیشک تمہارے تھکنے یا تازہ ہونے کا انحصار خود تم ہی پر تھا تمہیں اور زیادہ نہ تھکنے دینا چاہیئے تھا۔ تمہاری اِن باتوں کے متعلق کہ جب تمہارے نزدیک سے کوئی شادی شدہ جوڑا آپس میں میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہوئے گذر جاتا ہے تو تمہارے دل میں یہ احساس بڑی شدت کیساتھ چٹکیاں لینا شروع کر دیتا ہے کہ کیا بُرا تھا اگر تمہارا بھی کوئی ایسا ہوتا کہ جو صرف تمہارا ہی ہوتا۔ کوئی ایسا گھر، کہ جس میں بغیر تمہاری اجازت کے ایک تنکا بھی اِدھر سے اُدھر نہ کیا جاسکتا۔ تمہاری کوئی انفرادیت ہوتی، تمہیں کچھ سمجھا جاتا ——— میں سوچتا ہوں یہ الفاظ تمہارے منہ سے نکلنے کے لائق تو نہ تھے۔ ایسے حسین جمیل خواب کہ تم دُلہن بن کر کسی کے ہاں جاتیں۔ اگر واقعی تمہارے خواب تھے اور اُن کی تشکیل کے لئے تمہارا دل اس بُری طرح تڑپتا تھا تو تمھیں ایک نامکمل عورت کہنے سے پہلے مجھے ہچکچانا پڑے گا لیکن اس میں بھی میرا کوئی قصور نہیں کہ میں نے کبھی

ہچکچانے کی ضرورت محسوس نہیں کی ۔ تم اس قسم کے جذبات سے کس قدر بالاتر ہو تمہارے ان لفظوں میں پنہاں زندگی کے پورے نہ ہو سکنے والے سپنوں کے متعلق غور کرنے کی بجائے صاف بیانی سے کام لیکر اگر میں یہ کہہ دوں کہ تم بہکنے لگ جاتی تھیں تو صحیح ترجمانی ہو گی۔ کس قدر عجیب دل بستگی کے سامان تھے اس وقت جب نور کی تابانی سے تمہارا چہرہ چمک اُٹھتا تھا، میں کامل وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں زندگی کی کوئی رستی کارفرمانہ ہوتی تھی ۔

تمہاری کئی دوسری معجزہ نمائیاں بھی تمہاری زندگی کی شاہراہ سے ایک دم ہٹ جاتی تھیں ۔ تمہیں یاد ہوگا کہ جن دنوں تمہارے سیٹھ کو اپنے کاروبار کے سلسلے میں کچھ عرصے کے لئے واپس جانا پڑ گیا تھا اور ہم تقریباً آٹھوں پہر ہی ایک ساتھ رہا کرتے تھے تو ایک دن تم نے مجھ سے اپنا کوئی معاشقہ سُنانے کی فرمائش کی تھی حالانکہ میری زندگی میں اس قسم کے چند ایک واقعات رُونما بھی ہو چکے تھے لیکن اس وقت میں ایک من گھڑت قصّہ لے بیٹھا تھا ۔ پھر جب میں نے اس خیالی محبوبہ کے خدوخال کو جو بہت حد تک تم ہی سے مُشابہت رکھتے تھے ۔ اس کی لطیف مسکراہٹیں کسی دُلہن کے سے شرمیلے انداز کو بیان کرنا شروع کیا تو اس بات کو قدرے سمجھتے ہوئے بھی کہ در اصل میں تمہارا ہی ذکر کر رہا ہوں ۔ تمہارے چہرے پر غیر معمولی اکتاہٹ پیدا ہو گئی تھی اور تم نے جلد ہی اور اور باتیں چھیڑ کر میری توجّہ اپنی طرف منتقل کر لی تھی۔ میری طرح تم بھی یقیناً اُسے ایک فروعی سی بات سمجھتی ہو گی ۔ تمہارے خیال میں بھی اس کا سبب محض تمہارا اپنے حُسن سے مرعوب کر لینے کا کمال فخر ہوگا کہ جس کی بنا پر تم کسی بھی دوسری عورت کی تعریفیں نہ سُن سکتی تھیں لیکن اگر کوئی تمہارے اندر کی

عورت کے زندہ ہونے پر اعتبار کر لے تو اس کے لیئے ایک یہی واقعہ ایک ہنگامے کا رُوپ بدل سکتا ہے۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب انہی دنوں ایکمرتبہ ہم فیروزپور نالے پر تفریح کے لیئے گئے تھے اور وہاں ایک لڑکی مجھے بے طرح گھُورنے لگی تھی اور جب اس کی ان آنکھوں کی شبہ پاکر میں نے اس سے گفتگو کرنا چاہی تھی تو تم نے مجھے روک دیا تھا۔ یہی نہیں، تم اس کی طرف قہر آلُود نگاہوں سے بھی دیکھتی رہی تھیں جس کے نتیجے کے طور پر اس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مُسکرانا شروع کر دیا تھا میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ طنز تمھارے اس فعل پر تھی یا اُس نے ہم میں کوئی تقابل دیکھ لیا تھا۔ بہرحال جب تم نے دیکھا کہ میں اس میں دلچسپی لے رہا ہوں تو تم فوراً ہی وہاں سے چلے آنے پر زور دینے لگیں۔ وہ تم سے کچھ زیادہ خوبصورت تو نہ تھی لیکن وہاں سے آتے وقت جس نفرت کا اظہار مجھے اس کی آنکھوں میں دکھائی دیا تھا میں وہاں سے آنے کو تیار نہ تھا۔ کچھ ایسے ہی میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ کسی بھی طرح اسے اس بات کا یقین ہو جائے کہ اس نے میرے ساتھ تمھیں دیکھ کر جو اندازہ لگایا ہے وہ درست نہیں یہ ایک فطری بات ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر کوئی اصلیت بھی ہو تو اسے بھی جھٹلا دینے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ حالانکہ عموماً اس کشش کی میعاد کہ جو ایک جوان عورت اور جوان مرد کے ایک دوسرے کو دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے ایک یا دو لمحوں سے تجاوز نہیں کرتی۔ بس یونہی آمنا سامنا ہو جانے سے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں پھر آدمی کہیں چلا جاتا ہے، عورت کہیں چلی جاتی ہے۔ دوبارہ کسی کو کسی کا خیال تک نہیں آتا۔ لیکن اس وقت وہ ضرور ایک دوسرے کو دیکھیں گے اور اُن

کے چہروں پہ خود بخود کچھ یہ نقش بھی پیدا ہو جائیں گے کہ اس سے پہلے انھوں نے کبھی کسی کو ان نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ اس وقت وہ ہر ممکن لیکن شائستہ طور پہ اس دیکھنے کی معیاد کو طول دینے کی کوشش کریں گے لیکن میں نے کوئی پس وپیش نہ کی تھی۔ ایک تمہاری خود سپردگی کے زیرِ خیال اُن دنوں میں اس ایسی سینکڑوں لڑکیاں تم پر قربان کر سکتا تھا۔

جہاں کہیں بھی ہم اکٹھے گئے اس معاملے میں پاسبان کی طرح تم میری نگرانی کرتی رہیں۔ ہر وقت میرے حُسنِ اخلاق کو سراہتے رہنا تمہارا معمول تھا۔ تمہاری اس قسم کی باتوں کے متعلق دھیان دوڑاتے ہوئے مجھے اچنبھا ہوتا ہے کہ آخر وہ سب کیوں کیا جاتا تھا۔ تمہاری وہ حرکات کیا معنی رکھتی تھیں۔ حالانکہ تمھیں اس طرز کی دنیاوی باتوں سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اور پھر جبکہ اس آخری لمحے تک کہ جب اُس بھینسے کے ساتھ تم ملک کے نہ جانے کس گوشے میں چلی گئیں، تمہیں مجھے اپنے ہونٹ تک چُومنے کی اجازت نہ دینا تھی۔

"تجھے کیا کچھ نہیں سہنا پڑتا"! میرے کسی ایسے مذاق کا کہ جو تمہارے اور تمہارے اس سیٹھ سے متعلق ہوتا تھا اس ایک فقرے میں عذر پیش کرتے ہوئے تم اپنی نگاہیں اُفق سے پرے نہ جانے کس نقطے پہ مرکوز کر لیتی تھیں۔ بسا اوقات خلا میں گھُورنے کی بجائے تم میری طرف بھی دیکھنے لگتیں۔ اس وقت تم جس قدر ساری کی ساری ایک طرح کے رحم کی ملتمس بننے کی کوشش کیا کرتی تھیں تمہارا حُسن اور بھی بے پناہ ہو جاتا تھا عورت کا حُسن اپنی انتہا تک جا پہنچا ہے۔ جب اپنے اس احساس کو ظاہر کرنے کی غرض سے کہ وہ مجبُور ہے وہ مظلُوم ہے، وہ مجبُور اور مظلوم بننے کی کوشش کرنے

لگے۔ اور اگر اس کے ساتھ ہی اس کے تھک جانے کی چاشنی بھی شامل ہو پھر تو جیسے سونا کُندن بن جائے اس کے حُسن میں ایک۔ ناقابلِ بیان سی لطافت اور کیفیت پیدا ہو جاتی ہے

تم کہا کرتی تھیں کہ اب تم نے اس سیٹھ سے اپنی تھکاوٹ کا اظہار کرنا ترک کر دیا ہے۔ کس قدر ضرورساں کمال تھا کہ اس کی بجائے تم نے مجھے کہ جو اس لذت آمیز تھکن کے نئے بلبلا سا رہا تھا اس کے متعلق کہنا شروع کر دیا تھا۔ تمھارے کہنے کے مُطابق تم یہ چاہتی تھیں کہ کوئی تمھیں کچھ نہ کہے۔ وہ سیٹھ تمھیں کچھ نہ کہے جس نے تمھارے وارثوں کو منہ مانگے دام چکائے تھے۔ اور جو اپنے لگائے ہوئے سرمائے سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ میں تمھیں کچھ نہ کہوں کہ جس کے ذہن پر تم ایک کابوس بن کر چھا چکی تھیں۔ اور جسے اگر ایک مرتبہ کے لئے ہی تمھارے ہونٹوں کو چھونے کا چکمہ دیدیا جاتا تو چند ہفتے تو کیا سالہا سال تک تمھاری ہاں میں ہاں ملائے جاتا۔ آخر تمھاری اس ذرا سی بات پر کہ تم تھک گئی ہو کوئی تمھیں کیونکر معاف کر سکتا تھا۔ تم ایسی عورت کا جو رُوپ ہم دُنیا والوں کے ذہن پر مرتسم ہے وہ تو کچھ اس بات کا شاہد ہے کہ تم کبھی تھک ہی نہیں سکتیں۔ اس میں میرا قصُور ہے نہ تمھارے اس سیٹھ کا۔ ہمارا ماحول ہی کچھ ایسا ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبے میں زیادہ سے زیادہ لینا ہی چاہتے۔ خود تمھاری زندگی سے بھی اس حقیقت کو جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ تمھارا یہ کہنا تھا کہ تم نے دیا ہی دیا ہے لیا کچھ بھی نہیں۔

اکثر میرے دل میں یہ زہر بھی بھر جاتا ہے کہ وہ سیٹھ تمھارے مستحق نہ تھا۔ آخر اُسے یہ حق کیوں حاصل تھا کہ وہ تمھیں یا تم ایسی جتنی بھی عورتوں کو چاہے خرید لیتا۔ ان کے ساتھ جی آیا سلوک کرتا ــــ لیکن میرے اس سوچنے یا سٹپٹانے سے کیا ہو سکتا ہے

جسموں کی خرید و فروخت کبھی بند نہ ہوگی۔ جب تک صدیوں کا یہ آہنی چکر، یہ مہاجنی دَور چلتا رہے گا اور جب تک عورت کا شباب زندہ ہے یہ بیوپار ہوگا۔ وہ تمھیں خرید سکتا ہے، اس نے تمھیں خرید رکھا تھا اس سے زیادہ اُسے کچھ سوچنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں بھی اگر اس کی جگہ ہوتا تو یقیناً مجھے بھی یہ ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ لیکن آہ! کہ جو تمھارا مستحق تھا اسے تم نے اپنے ہونٹ تک نہ چُومنے دیئے۔ پھر میں سوچنے لگتا ہوں کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر میں بھی ایک سیٹھ ہوتا۔ چاندی کے سکوں کے عوض تمھیں خرید سکتا دن بھر اپنی توند سہلاتا ہوا اور کھٹی کھٹی ڈکاریں لیتا ہوا اپنے لاکھوں کے کاروبار کی باتیں سُنا سُنا کر تمھیں ہنساتا رہتا اور کبھی ایک رات بھی تمھیں علیحدہ چارپائی پہ نہ سونے دیتا۔ پھر اگر صبح تم یہ کہتیں کہ تم تھک گئی ہو تو میری چھاتی پھول جاتی۔ سونے چاندی کے مرکبات اور کشتوں کے بجٹ میں چند سینکڑے اور جمع ہو جاتے اور تمھیں ایک پیاری سی مگر فحش گالی کے ساتھ میں یہ کہتا کہ اچھا اب کی دفعہ تم مجھے تھکانے کی کوشش کرنا۔ اور تمھیں ہر ممکن کوشش کرنا پڑتی۔

میں نے ناحق تمھارے حُسن کی تعریفیں کیں۔ تمھارے احساسات و محسوسات کے پیش نظر کہ جن میں بناوٹ کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ تمھیں خواہ مخواہ طُوفان میں گھرے ہوئے ایک ناچیز تنکے کے مترادف کہتا رہا۔ تم اس قسم کے جذبات سے کس قدر الگ تھلگ تھیں اگرچہ یہ حقیقت ان دنوں بھی روزِ روشن کی طرح مجھ پر عیاں تھی لیکن چونکہ تمھارا حُسن میرے رگ و پے میں بُری طرح سرایت کر چکا تھا۔ اور میرے قریب تر ہونے کے باوجود تم میری پہنچ سے باہر تھیں، مجھے اتنا سوچنے کی بہت کم مہلت ملتی تھی۔ جُوں جُوں وقت گذرتا جاتا تھا میری تشنگی ناقابلِ برداشت ہوتی جاتی تھی۔ باوجود یکہ کبھی بالکل

مغلوب الجذبات سا ہو کر دبے گلے سے میں اپنی چھپٹاہٹ کا اظہار بھی کر دیتا تھا لیکن مجھے عام انسانوں سے بدرجہا بہتر کہنے کا جو ہتھیار تم استعمال میں لاتی تھیں، میرے اپنے تمام ہتھیار کند ہو جاتے تھے۔ جب بھی کبھی ہو، پیش کش تمہاری طرف سے ہی ہو، مجھے تمہیں بقدر کی نگاہوں سے دیکھنے اور تمہارے حُسن کی تعریفوں کے سوا کوئی دوسرا چارہ نظر نہ آتا تھا۔ یُوں تمہارا حُسن تھا بھی تو قابلِ تعریف ہی۔ تمہاری آنکھیں کہ جو ہر وقت گویا نیند کا غلبہ روک رہی ہوتی تھیں۔ شاید اُنھیں پوری طرح کھُلنے کے لئے بنایا ہی نہ گیا تھا۔ کبھی جب تم اُنھیں پوری طرح کھولنے کی کوشش کیا کرتی تھیں تو ان کے غلافوں پر کچھ اس طرح کے شکن پڑ جاتے تھے اور کچھ یہ محسوس ہونے لگتا تھا، کہ اب اگر ان شکنوں کو کھولنے کے لئے تمہاری دہری ہو رہی پلکیں نیچے آئیں گی تو تمھیں تکلیف ہوگی ـــــ تمہارے ہونٹوں کے متعلق اس سے زیادہ کچھ اور کہنا لاحاصل ہے کہ کسی وقت بھی اُنھیں دیکھنے سے یہی دھوکا ہوتا تھا کہ وہ چوُمنے کے لئے پیش کئے جا رہے ہیں۔ کس قدر رسیلے کچھے اور نازک نازک تمہارے خدوخال تھے ہونٹوں کے سنگم اور ٹھوڑی کے اُبھار کو دلکش طریقے سے نُمایاں کرتی ہوئی تمہارے رخساروں کی پھبن، بیشک اُن پہ پکے ہوئے سیب کی سی رنگت لانے میں غازے کا بھی ہاتھ ہوتا تھا۔ لیکن جیسے کسی قابل بڑھئی نے ساگوان کی لکڑی پر کمال صفائی سے رندہ کر دیا ہو، ان کی پھسلن اور ملائمت کچھ اس قدر دل کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی تھی کہ غیر اختیاری طور سے اُن پہ ہاتھ پھیرنے اور پھیرتے ہی رہنے کو جی مچل اُٹھتا تھا۔ اُسی رندے نے تمھاری مرمر ایسی سپید، لانبی گردن کو تراشا تھا۔ جس کا نچلا حصّہ قوس کی شکل میں پھیلی ہوئی اور خوبصورت گڑھے بناتی ہوئی گلے کی ہڈیوں میں پیوست

ہوکراس کے حُسن میں اور بھی دلفریب اضافہ کر دیتا تھا۔لیکن میرا بیان نامکمل رہے گا اگر میں تمہارے جسم کی خوبصورتی کو نظر انداز کر دوں۔ میرے خیال میں عورت کے چہرے کی نسبت اس کے جسم کا حُسن کہیں زیادہ کشش کا حامل ہوتا ہے۔ کچھ یہی بات ہے کہ میں تمہارے حُسن میں کوئی بھی خامی ڈھونڈنے سے قاصر ہوں۔کس قدر متناسب اور گدرایا ہوا تمہارا جسم تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب تم پہلی مرتبہ میرے سامنے کھلکھلا کر ہنسی تھیں اور تمھیں میرے کندھے کا سہارا لینا پڑا تھا تو میں کچھ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اس سمے اگر تمھیں کوئی ــــ سہارا نہ ملتا تو اس مہین نیلگوں غلاف میں لپٹا ہوا تمہارا جسم نما سپید سنگ مرمر ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ۔گر پڑتا۔ساڑھی باندھنے کا سلیقہ نہ جانے تم نے کہاں سے سیکھا ہے۔میں سچ کہتا ہوں اگر تم اپنے مخصوص انداز سے ساڑھی باندھ کر کسی نیم تاریک جگہ پر کھڑی ہو جاؤ تو یہی دکھائی دے گا کہ تم نے کوئی بھی کپڑا نہیں پہن رکھا۔بغیر آستینوں کے بلاؤز،جن کے گلے کی کاٹ سینے کی گولائیوں کو قیامت خیز طریقے سے نمایاں کرتی ہوئی اُن کے درمیانی حصّے کی گہرائی تک چلی جاتی تھی۔ پھر تمہاری کلائیوں سے لیکر کندھوں تک، کا تمام گُداز پن ـــــ اور نیچے ساڑھی میں سے تمہاری رانوں کے اُبھاروں کا چمک چمک پڑنا ـــــ میں کہاں تک بیان کروں کہ تمہارے حُسن میں مرعوب کر لینے کی غیر معمولی قوّت ہے۔میں تمھیں یقین دلا سکتا ہوں کہ میری جگہ اگر کوئی دوسرا مرد ہوتا تو ـــــ لیکن یقین دلانے کی ضرورت کیا ہے۔ تمھیں تو میرے منہ سے اپنے حُسن کی تعریفیں سُننا بھی ناگوار گذرتا تھا۔اگرچہ تمھیں بالکل ناپسند بھی نہ تھا لیکن تم کہا کرتی تھیں کہ مرد عورت کی تعریفیں کس لئے کیا کرتے ہیں، اس سے تم بخوبی واقف ہو۔ اور تمہارے کہنے کے مُطابق چونکہ

تم اس سے بخوبی واقف تھیں اس لئے وہ سب تمھیں اچھا نہ لگتا تھا۔ اور شاید اب صرف ایک ہی بات رہ گئی ہے جس کے بعد میرے پاس کہنے کے لئے کوئی بھی بات نہ رہے گی ہو سکتا ہے جو کچھ اب تک میں کہہ چکا ہوں اُسے تم میری کم فہمی قرار دو یا میری تشنہ کامی کا ردِ عمل لیکن جس ایک واقعہ کا ذکر اب میں کرنے والا ہوں اس کی صداقت سے تم کسی صورت بھی مُنکر نہ ہو سکو گی ـــــ اپنے اس خط کے شروع میں میں کہہ چکا ہوں کہ اگر تم اپنے آپ کو سادہ لوح ظاہر کرنے کا ڈھونگ نہ رچاتیں اور جو کچھ کہ تم تھیں اسی رُوپ میں میرے سامنے رہتیں تو شاید تم مجھے زیادہ اچھی طرح بے وقوف بنا سکتیں۔ جس پر طرّہ یہ ہوتا کہ میں اپنے تئیں انتہائی عقلمند تصور کرتا۔ اس آخری شام بھی کہ جس کی اگلی صبح کو تمھیں اپنے سیٹھ کے ساتھ واپس چلے جانا تھا اور تم نے ایک مرتبہ پھر نہایت کرب آمیز لہجے میں اپنی زندگی، اپنی زندگی کی بے حاصلی، اور میری ناقابلِ فراموش قُربت، میری بڑائیاں بیان کی تھیں۔ اور آخر میں دفعتاً یہ کہہ کر کہ اگر کبھی میں تمھارے متعلق صحیح رائے قائم کر سکوں، دُنیا والوں کی طرح میرا دل اگر چھوٹا نہ رہے تو مُصمّم ارادے کے بعد بلا کسی خوف و خطر میں تمھیں اپنے پاس بُلاؤں، تم جہاں کہیں بھی ہو گی چلی آؤ گی، تم نے اپنی آنکھیں نمناک کر لی تھیں ـــــ اگر تم اس وقت بھی اپنے ہونٹ چُومنے کے لئے پیش کر دیتیں اور تم نے اپنے رخساروں کو میرے ہاتھوں کے پیالوں میں سونپ دیا ہوتا تو شاید میں کوئی بڑے سے بڑا قدم اُٹھانے کے لئے بھی تیار ہو جاتا لیکن نہ جانے کس مصلحت کے پیشِ نظر تم نے ایسا نہ کیا اس لحاظ سے تو میں تمھارا ممنون بھی ہوں کہ تم نے مجھے اپنے ہونٹ نہ چُومنے دیئے اور ایک ناگہاں آفت سے بچا لیا۔ اس وقت جو کس مپرسی اور احساسِ کمتری تمھارے

آنسوؤں میں تیرنے لگا تھا، میرے ذہن کے ہر گوشے پر ایک بوجھل سا غبار مسلط ہو گیا تھا۔ کوئی غیر مرئی طاقت میرے سوچنے سمجھنے کی قوت کو سلب کرتی چلی جا رہی تھی۔ تم کیا تھیں، اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے تمھیں حاصل کرنے کے لئے کئی منصوبے بھی باندھنے شروع کر دیئے تھے۔ ایک عورت اور پھر ایک ایسی عورت کہ جس کے بدن کو ہاتھ لگانے ہی سے اس کے میلا ہو جانے کا احتمال ہو۔ اگر مخاطب مرد کی جوانمردی کو للکارتی ہوئی رد دے تو کوئی اچنبا نہیں جو نا ممکن ممکن میں بدل جائے۔ لیکن ذرا سوچو کہ میرے دل پر کیا گذری ہوگی۔ جب اس وابستگی کے کچھ ہی دیر بعد اپنے آنسوؤں کو پونچھ کر اور یہ کہہ کر کہ سیٹھ تمھارا انتظار کر رہا ہوگا تم مجھے اکیلا چھوڑ کر اپنے ہوٹل میں چلی گئیں۔ فطری طور پر میرے ان خیالات نے کیا کیا نہ قہر ڈھائے ہوں گے کہ میں تو تمھارے اور اپنے مشترکہ مستقبل، خوش آئند زندگی کے متعلق قیاس آرائیوں میں مگن ہوں اور تم اس بھینسے کی آغوش میں پہنچ چکی ہوگی۔ وہ تمھیں چوم چاٹ رہا ہوگا۔ پھر تمھارے یقین کے لئے کہ میں عام دنیاوی انسانوں سے اونچا اٹھ چکا ہوں، مجھ میں تمھیں ہر کسی کی تفریح کا سامان قرار دینے سے انکار کرنے کا صحیح مادہ پیدا ہو گیا ہے، نہ جانے مجھے کب تک انتظار کرنا پڑتا اور اس دوران میں تم ——

نہیں، تم اپنی اس زندگی ہی کو غنیمت سمجھو۔ کیا ہوا اگر تم قیاس کی حد تک حسین ہو۔ تمھارا جسم سپید سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے اور تمھارے ذرا سا کھل کھلا کر ہنسنے پر اسکے ٹوٹنے اور ریزہ ریزہ ہو جانے کا خدشہ ہے۔ یہ بھی کوئی ایسی اہم بات نہیں جو تمھاری آنکھیں ہر وقت نیند کا غلبہ روکے رہتی ہیں، یا تمھارے ہونٹوں کے لئے کوئی تشبیہہ نہیں مل سکتی —— تمھیں شادی شدہ جوڑوں کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ کر خود کو

وہم وسراب میں مُبتلا نہ کرنا چاہیئے۔ جو عورتیں بیاہ کر لائی جا سکتی ہیں تم ان سے قطعی مختلف ہو۔ تمہارے اور اُن کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے اور یہ ایک ایسا فرق ہے کہ جسے سمجھنے کے باوجود تم نہیں سمجھ سکتیں۔ تم اگر واقعی تھک بھی چکی ہو تو بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ تمہاری زندگی کا تو ماحصل ہی تھکنا ہے اور تھکانے کی کوشش کرنا ہے جس طرح تمہاری زندگی کی بچیس بہاریں عطر میں نہاتے، بیش قیمت ملبوسات پہنتے اور اپنے ہونٹوں میں بیر بہوٹی اور پنجتارے کے پھولوں سی گہری سرخی، چمک اور رسیلا پن سموتے گذر گئیں ہیں۔ تمہاری آئندہ زندگی بھی اسی ڈگر پر چلے گی، اُسے چلنا ہی پڑیگا۔ تمھیں کسی سے کوئی توقع نہ کرنی چاہیئے۔ تمہارے لئے کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ بھنیسا کچھ نہیں کر سکتا کہ جس کے ساتھ اگلے برس شاید تم پھر گلمرگ کی کیف آور وادی میں سر کلر روڈ پر ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہوئی محوخرام ہوگی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا کہ جو تمہارے احساسات و افکار کا احترام کیا کرتا تھا۔ جو مرد کو توہم پرست، کمینہ خصلت اور نہ جانے کیا کیا کہہ دیتا تھا اور جسے تمہارے ہونٹوں کی تعریف کے لئے خود تم ہی سے کوئی تشبیہہ پوچھنی پڑتی تھی ——— تم کس قدر عجیب تھیں۔ تمہاری باتیں کس قدر عجیب تھیں۔ لیکن تمہارے ہونٹ بھی تو عجیب تھے۔ کس قدر والہانہ پن تھا ان ہونٹوں میں۔ والہانہ پن اور بے ساختگی ——— ان ہونٹوں کا سنگم ——— آہ، وہ ہونٹ ———!

ڈِھیٹ

رات کے گیارہ بج رہے تھے، میں اپنے لحاف میں نیند سے بوجھل آنکھوں سے عورت مرد کے باہمی تعلقات پر ایک انگریز فلسفی کے خیالات کا مطالعہ کر رہا تھا کہ یکایک مکان کی نچلی منزل میں بسنے والی رام دُلاری کی چیخیں سُنائی پڑیں۔ وہ حسبِ معمول خاوند کے ہاتھوں پٹ رہی تھی۔ اس میں ایسے تعجب کی بات تو نہ تھی کیونکہ گالی گلوچ اور مار پیٹ تو ایک طرح سے ان کے روزنامچے میں شامل تھے مگر مجھے اس بات پر افسوس ہوا کہ آج صبح ہی تو میرے بار بار سمجھانے پر جے چند نے کانوں سے اُنگلی چھُوا کر اپنی کمینگی اور رذالت کا اعتراف کرتے ہوئے آئندہ ایسا نہ کرنے کا اقرار کیا تھا۔ لیکن اب پھر وہ ....

چیخیں بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں اور جے چند کی فحش بیچ در بیچ گالیاں بھی بدستور اپنے جوبن پر تھیں۔ ساتھ کی چارپائی پر لیٹی ہوئی میری بیوی نے کروٹ

بدلی اور ایک غیرارادی آہ کھینچ کر سُننے کو چھپانے لگی جو یہ ہڑدنگ سن کر ریں ریں کرنے لگ گیا تھا۔

میں نے پھر کتاب کو آنکھوں کے سامنے کھینچ لیا۔ فلسفی کہہ رہا تھا......

"شادی دراصل ایک خوبصورت رقص ہی تو ہے۔ ہر جوڑا موسیقی کے تال پر قدم اُٹھاتا اور بڑھاتا چلا جائے۔ رواں۔ دواں۔ رواں۔ دواں ــــ اگر یہ رقص کسی ایک کی لرزش سے بے ہنگم ہوتا نظر آئے تو دوسرے کو اختیار ہے کہ وہ کوئی اور بہتر ساتھی چُن لے۔ اس میں عورت اور مرد دونوں کے حُقوق مساوی ہیں......"

اُف! اب تو کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ اُن کے دونوں بچے بھی جاگ اُٹھے تھے۔ اور اس ہڑدنگ شور کو دوبالا کرنے میں والدین کا خاص ہاتھ بٹا رہے تھے۔

میں جھنجلا اُٹھا۔ کسی طرح اس بیہودہ بکواس کو بند کراؤں، میں چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور فرش کے درمیان بنے ہوئے سلاخوں والے روشندان پر سے چٹائی اُٹھا کر نیچے جھانکنے لگا ــــ رام دُلاری چارپائی کے پائے سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھی چھپٹا رہی تھی۔ اُس کے بال اُس کے کپڑے بے ترتیبی کی حالت میں اِدھر اُدھر لٹک رہے تھے۔ اور اُس کی پھٹی پھٹی، اُبلتی آنکھیں ٹپ ٹپ آنسو گراتی ہوئی جے چند کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چپل کی طرف دیکھ دیکھ کر سہم رہی تھیں کہ جس کا چمڑہ ابھی ابھی اُکھڑ کر لٹک گیا تھا ــــ اُدھر جے چند زیادہ نشے کی حالت میں کھڑا نہ رہ سکنے کے باوجود کھڑا ڈگمگاتا ہوا اور سامنے کی ہر چیز کو کھا جانے والی نظروں

سے دیکھتا ہوا کبھی رام دُلاری کی ماں اور کبھی اس کی بہن سے قریبی رشتے جوڑ رہا تھا۔ رہ رہ کر اس کا چپل والا ہاتھ اُٹھ جاتا جس سے رام دلاری کی چیخ کے ساتھ اس کے جسم کا عضو عضو اُبھر اُبھر پڑتا۔ دونوں بچے ساتھ کی چارپائی پر دبکے سہما سہما رونا روتے تھے اُن کی آنکھیں کبھی پٹتی ہوئی ماں کی طرف اور کبھی پیٹتے ہوئے باپ کی طرف اُٹھ جاتیں۔ اُن معصوم آنکھوں سے بیچارگی کا ہی لاوا پھوٹ سکتا تھا کہ پھوٹ رہا تھا۔

میرے جی میں آئی کہ نیچے جا کر جے چند سے جھڑپ لوں، کچھ اور نہیں تو اِس بات کا ہی رعب دِکھا کر اُسے چُپ بٹھا دوں کہ تم ہر روز اڑوسیوں پڑوسیوں کی نیند حرام کرتے ہو۔ ــــ میں کل تمہاری رپورٹ کر دوں گا۔ لیکن جونہی میں نے زینے کی طرف قدم بڑھائے میری بیوی نے مجھے روکا ــــ آپ کیوں خواہ مخواہ کی جھک جھک مول لیتے ہیں۔ بجلی بجھا کر سو رہیئے۔ لاجونتی سے آج بھی میں نے مکان کے بارے میں کہا تھا، دو ایک دن تک خالی ہو جائے گا تو وہاں اُٹھ جائینگے ــــ میں پھر آ کر چارپائی پر تن گیا اور دوبارہ کتاب کھول لی۔ فلسفی کہے جا رہا تھا....

"یہ ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے جو شاید کبھی حل نہ ہو گا۔ عورت میں مرد کی نسبت جنسی کشش بدرجۂ اتم موجود ہے اور ماہر نفسیات کے تجربے کی بنا پر یہی وہ کشش ہے جس سے ہر مرد عورت کا غلام ہو کر رہ جاتا ہے۔ اُس کے ابرو کی ایک اُٹھان یا آنکھ کی ذراسی جنبش سے اس قدر فتنے بیدار......"

جے چند اور بھی بُری طرح رام دُلاری پر پل پڑا۔ اور غلیظ گالیوں اور شور و غوغا سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔

میری نظریں کتاب پر نہ ٹِک سکیں۔ نظریں جماتا تو تھوڑی دیر بعد یوں محسوس ہونے لگتا جیسے صفحے پر کی ہر سطر رقص گاہ کے لان میں کچھ ایسے ہی کھُدی ہوئی ٹیڑھی میڑھی کھائی ہے اور ہر حرف ہر نقطہ موسیقی کے تال کو مُنہ چڑاتا، ایک عجیب بے ہنگم وحشیانہ ناچ ناچتا ہوا یار اُنہی روشوں سے ہو ہو کر گذر رہا ہے۔ جھنجھلا کر میں نے آنکھوں کو سہلایا اور دماغ کو جھٹکے دیئے۔ مگر جے چند کی موٹی موٹی گالیاں — اور رام دُلاری کی چیخ و پکار برابر میری کوفت کا باعث بنی رہیں۔

ہمیں اس مکان میں آئے کُل پندرہ ہی روز ہوئے تھے۔ لیکن ان پندرہ دنوں میں ایک دن بھی جے چند کا بِن پیئے اور رام دُلاری کا بِن پٹے نہیں گذرا تھا۔ آٹھوں پہر ان کی گرہستی نرک کا نمونہ بنی رہتی تھی۔ میری بیوی نے بارہا رام دُلاری سے اس لعن طعن اور مار پیٹ کی کوئی خاص وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی مگر وہ سوائے اس کے کہ "نہیں بہن یہ تو اُن کی عادت ہے!" کبھی کچھ نہ کہتی۔ رات کو چاہے خاوند مار مار کر اُسے ادھ موئی کر دے یا اس کے میکے گھر کے ہر فرد کو چھان پُن کر پھینک دے مگر صبح جب وہ گلی کی عورتوں میں رل بیٹھتی تو سب کی طرح ہنس ہنس کر اپنے خاوند کے گنوں ہی کا بکھان کرتی۔

یہ لجاجت اُسے ورثہ میں ملی ہوگی، میں سوچنے لگا۔ ڈولی میں سوار کراتے ہوئے ماں نے جانے کیا کیا اُس کے دماغ میں بھر دیا ہوگا — ہونے والے جیون ساتھی کے پاس آنے سے پہلے اُس نے اپنے دِل میں جانے کیسی کیسی اُمنگیں سمو رکھی ہوں گی — بیاہ سے پہلے ہر کنواری کی طرح اس نے بھی چوری چھپے کی جھلوں میں اپنے دُولھا کے متعلق جانے کیسے کیسے اندازے لگائے ہوں گے۔ اور جانے

بڑی بوڑھیوں سے سُن سُن کر پتی کو بس میں رکھنے کے کون کون سے گُر پلّو میں باندھے ہوں گے، اور کیا وہ اپنے رنگ رُوپ اور جوبن پر من ہی من میں اٹھلاتی نہ ہوگی۔ جنسی کشش، ابرُو کی اٹھان۔ آنکھ کی جنبش کہ جن سے سینکڑوں فتنے بیدار ہو اٹھتے ہیں اور جن کے سبب ہر مرد عورت کا غلام ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن۔ لیکن......

اور صبح جب میں بجے چند سے شراب نوشی کو ترک کر دینے کے لئے کہہ سُن رہا تھا تو وہ بڑے عاجزانہ انداز میں کہنے لگا تھا۔

اجی صاحب، آپ کو کیا خبر کہ لے دے کے بس یہی ایک شراب ہی تو ہے جس نے مجھے اب تک زندہ رکھ چھوڑا ہے ـــــ اور جو آپ رام دُلاری کی بابت کہہ رہے ہیں، وہ تو دیوی ہے دیوی!

دیوی! ہونہہ! ان الفاظ کی یاد کے ساتھ میرے ذہن میں ایک عجیب قسم کی سڑاند گھس آئی۔ ایسی سڑاند جو شاید کوڑھی مُردے کے جسم سے ہی اُٹھ سکتی ہے۔ اس سڑاند سے چھٹکارا پانے کی خاطر میں نے کتاب کو پھر مُنہ تک سرکا لیا ـــــ

......عورت ہی کا وجود ہے جو سب سے زیادہ مرد کے ذہن پر سوار رہتا ہے۔ مرد بیوقوف، اُجڈّ اور گنوار ہے۔ جب تک کہ اس کی زندگی میں عورت کا دخل نہیں ہوتا۔ محض عورت ہی انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہے۔ بڑے بڑے شاعر، فلسفی اور مہاتماؤں کی زندگیوں کو امر بنانے میں ان کی پشت پر سدا عورت ہی کا ہاتھ رہا ہے۔ عورت......

عورت ! رام دُلاری ! ہونہہ ! یہ کس مٹی کی عورت ہے، اسے کیوں اپنی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا ۔ جاہل ، بے وقوف ، اور کیا اس جاہل عورت کے بیٹے بڑے ہو کر شاعر، فلسفی یا مہاتما بن سکیں گے ؟ ــــــــ یقیناً وہ بھی اپنے باپ ہی کے نقشِ قدم پر چلیں گے اور ان کی بیویاں ــــ میرا ذہن کانپ اُٹھا ۔ جانے کتنی بیویاں رام دُلاری ہوں گی اور کتنے خاوند جے چند ــــــــ

خاوند شراب پیتا ہے، یہ اس کی عادت ہے ۔ وہ جُوا کھیلتا ہے، یہ اس کی عادت ہے ۔ رات کے دو دو بجے تک وہ نہ جانے کہاں رہتا ہے، یہ اس کی عادت ہے ۔ وہ مارتا پیٹتا ہے ، یہ بھی اس کی عادت ہے ۔ آخر یہ اس کی عادت کیوں ہے اور تم نے بھی چُپ رہ کر سب کچھ سہنے کی عادت کیوں ڈال رکھی ہے ۔ کیوں ؟ میں سُلگنے لگا ۔ بھلا کیوں سب مائیں اپنی بیٹیوں کو یہی ورثہ دیتی ہیں ۔ آخر احتجاج کا حق تو ہونا ہی چاہیے اور پھر مجھے اپنی شادی کے وہ بول یاد آنے لگے جو پروہت نے دُلہن کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر اس سے کہلوائے تھے ۔ "میں اپنے گھر میں سُکھی دُکھی جیسے بھی رہوں گی خوش رہوں گی ۔ پتی پرمیشور ہے ......"

اور میں سوچنے لگا ۔ رام دُلاری نے بھی جے چند کو پرمیشور کہا ہوگا ۔ شاید اسی لئے وہ اُف نہیں کر سکتی ۔ یہی اُس کا دھرم ہے ۔ یہی اس کا بھاگیہ ۔ مگر جے چند کیوں پرمیشور نہیں بنا ۔ اس نے بھی تو کچھ بچن دیئے تھے ۔ اُسے اپنا آدھا جسم مانا تھا ۔ جیون رتھ کا دوسرا پہیہ ۔ وہ کیوں اس کے بچن یاد نہیں دلاتی ۔ بھری پنچائت میں اُس نے اُسے سُکھی رکھنے کا یقین دلایا تھا ۔ کیوں اب وہ اپنا سُکھ نہیں مانگتی ۔ پنچایت تک اپنا دُکھڑا کیوں نہیں پہنچاتی ؟

اور اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنی بیوی کو پکارا ——— وہ نیند میں مگن ہو رہی تھی۔ میری آواز پہ ایک دم چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے میں نے اُس سے پوچھا — "کہو، اگر میں بھی جے چند بن جاؤں تو کیسی رہے؟"

کچھ اچانک جگا دینے اور کچھ اس عجیب سے سوال پہ تعجب اور سراسیمگی کی حالت میں وہ میری طرف دیکھنے لگی جیسے کہنا چاہتی ہو —" یہ کدھر کا سوال ہے!" لیکن پھر شاید اُسے بھی ماں کے دودھ کے ساتھ ورثہ میں ملی ہوئی کوئی نصیحت یاد آگئی کہ وہ سنبھل کر مسکرانے لگی۔ میں نے اپنا سوال پیار اور سنجیدگی سے دہرایا تو وہ سنجیدگی اور مذاق کے مِلے جُلے انداز میں چمک کر کہنے لگی —"جب تو آپ کو میرا نام بھی بدل کر رام دُلاری رکھنا ہوگا۔"

جانے اس کے ان الفاظ سے میرے ذہن کو کیوں اس قدر کوفت پہنچی۔ میرے جی میں آیا کہ کچھ اور نہیں تو اس انگریز فلسفی کی کتاب ہی کو اس کے مُنہ پر دے ماروں' اُسے چارپائی پر سے لڑھکا دوں اور اپنے کپڑے پھاڑ کر وحشیوں کی طرح ایڑیاں اُچھال اُچھال کر ناچنے اور چیخنے چلانے لگوں لیکن اگلے ہی لمحے اس کے مُنہ کے دائیں کونے تک لڑھک آئی ایک لٹ کو درست کر دینے کا خیال میرے ذہن میں تھرک اُٹھا — لیکن وہ پرے سرک کر روشندان میں سے نیچے جھانکنے لگ گئی۔ پھر اس نے مسکرا کر ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پاس آنے کو کہا۔ اور اب جو میں نیچے دیکھتا ہوں تو جے چند چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھا زمین پر بیٹھی رام دُلاری کے بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کر رہا ہے اور رام دُلاری کی سسکیاں لمحہ بہ لمحہ مدھم ہوتی جا رہی ہیں۔......

ازل سے......

اس نے کچھ ان نگاہوں سے میری طرف دیکھا، میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

لیکن وہ کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہتی تھی، شاید کوئی انوکھی بات۔ کوئی ایسا راز جسے کسی مصلحت کے پیش نظر اس نے اس وقت تک اپنے دل میں چھپائے رکھا تھا۔ اور اب اس خیال سے ظاہر کر دینے کی آرزو مند تھی کہ پھر تو شاید میری اس سے کبھی ملاقات نہ ہوگی۔ بہرحال وہ کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہتی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں اس نے اپنی ان مبہم سی نگاہوں پر ہی اکتفا کیا۔ آج بھی جبکہ وہ میرے سامنے نہیں۔ اور میں اتنا بھی نہیں جانتا کہ وہ اور اس کے باقی گھر کے افراد کہاں اور کس حال میں ہیں۔ اور جبکہ میں نے ان نگاہوں کا مفہوم سمجھنے کی بہت کوشش کی ہے۔ میں اس معمہ کو حل نہیں کر سکا۔ بارہا بیٹھے بٹھائے میرے دل میں خواہ مخواہ یہ خیال لہرا جاتا ہے کہ میں

اس کی اس گنگ زبانی، ان مُبہم نگاہوں کا مطلب بخوبی سمجھتا ہوں ..... صرف بیان نہیں کر سکتا یا بیان کرنا نہیں چاہتا۔ اور آج میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ نیلا اور اس سے متعلق تمام تلخ خیالات کو یکسر دل سے نکال دوں گا۔ میرے دل کا یہ کھٹکتا کانٹا، کھولتا لاوا اب میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو چکا ہے۔

آٹھ افراد پر مشتمل اس کنبے میں سے صرف وہی تین تھے جو جیسے تیسے بچ سکے تھے نیلا، چندرا اور انوپم ...... انوپم کی ماں، اس کا باپ، اس کے دو چھوٹے بھائی اور ایک جوان بہن یکے بعد دیگرے حادثات کی نذر ہو چکے تھے۔ برما سے بھاگنے کے دوران میں دونوں معصوم بھائیوں کو روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے بلک بلک کر جان دیتے ہوئے انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کی ماں ایک ہفتے سے زیادہ ساتھ نہ دے سکی تھی۔ اور باپ ...... کس قدر حسرت انگیز، المناک تھا وہ سماں جب خون تھوکتے ہوئے باپ کو نیلے آسمان کے سائے تلے، وسیع و عریض زمین کی آغوش میں بے یار و مددگار خدا کے بھروسے چھوڑ کر وہ آگے چل کھڑے ہوئے تھے۔

"خدا"...... رنج والم میں ڈوبی ہوئی نیلا اپنے مخصوص غمناک لہجے میں کہہ اُٹھتی ...... "سچ مچ انسان اس انسان سے کس قدر مختلف ہے جسے خدا کا بندہ کہا جاتا ہے اور خدا ...... یعنی اگر اس نام کی کوئی ہستی ہے تو وہ بھی اس سے کس قدر مختلف ہے، جیسا کہ ہم اسے سمجھتے ہیں!"

مجھے بخوبی یاد ہے کہ جب کبھی انوپم اپنی اس لاپتہ بہن کا ذکر کرتا تھا جو کلکتہ کے ہندو مسلم فسادات میں ایک صبح پڑوس میں اپنی ایک سہیلی کے ہاں جانے کے بعد

پھر کبھی لوٹ کر نہ آئی تھی۔ تو نیلا کی آنکھوں میں ایک خوفناک، خونخوار چمک عود کر آتی تھی۔ اس وقت کچھ یہ محسوس ہونے لگتا۔ جیسے اسے اپنے حُسن اپنی جوانی ہی سے نفرت نہیں، وہ دُنیا کے ہر انسان، دُنیا کی ہر شئے سے متنفر ہے۔ متنفر اور ہراساں اور چاہتی ہے کہ ایک شعلے کی صورت میں لپک کر ساری دُنیا سارے نظام کو جلا کر بھسم کر دے۔

نیلا..... نیلا کا نام لیتے ہی میرے سامنے بس بائیس برس کی ایک ایسی دوشیزہ آکھڑی ہوتی ہے۔ جسے دوشیزہ کہنا ایک طرح سے اس کی توہین کرنے کے مترادف ہے۔ دوشیزہ نہ کہہ کر اسے ایک عورت کہہ دینا زیادہ موزوں ہوگا۔ فقط اور فقط ایک عورت! نہ اس کی آنکھیں کنواری لڑکیوں کی طرح خواب آلود تھیں نہ اس کا چہرہ امید وبیم کے تاثرات سے متلاطم سانچے میں ڈھلے ہوئے چھریرے بدن کی مالک ہونے کے باوجود وہ ترغیب وہ تحریک اس کے جسم میں مطلقاً ناپید تھی جو اُس ایسی کنواریوں کے جسموں کا خاصہ ہوتی ہے۔ خود نمائی سے تو جیسے اُسے خدا واسطے کا بیر تھا۔ دانستہ طور سے وہ ہمیشہ ڈھیلی ڈھالی سپید ساڑھی پہنتی تھی کہ اس کا چہرہ اور بھی زردی مائل سپید ہو کر اپنی رہی سہی تازگی و آراستگی بھی کھو دے۔ علاوہ ازیں سر کے بالوں کو چوٹی کی صورت میں گوندھنے کی بجائے وہ بے ڈھنگا سا جُوڑا باندھتی تھی جس سے وہ کافی سن رسیدہ دکھائی دینے لگتی تھی۔

اور مجھے تو اس پہلے روز ہی کہ جب انو بھم نے مجھے اپنے ہاں چائے پر مدعو کیا تھا اور نیلا میرے مقابل کی کرسی پر بیٹھی ہماری باتوں میں دلچسپی لینے کی بجائے کھڑکی میں سے دُور آسمان کی وسعتوں میں کھو رہی تھی، اس کے چہرے کی غیر معمولی پیلاہٹ

اس کی غیر معمولی خاموشی سے شک گذرا تھا کہ وہ کسی انتہائی کربناک بیماری میں مبتلا ہے لیکن نہیں، دراصل اُسے کوئی روگ نہیں تھا۔ انوپم سے استفسار کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ بے مقصد طور پر کسی بھی طرف آنکھ اُٹھائے دیکھتے رہنا اس کی عادت تھی۔ یہی نہیں، ہر وقت تنہائی کی تلاش اور تنہائی میں بھی بلا وجہ آنکھوں میں آنسو بھر لانا۔ یہ سب اس کی عادات میں شامل تھا۔ انوپم کا خیال تھا کہ وہ ہر سمے اپنے دل میں اپنے ماضی اور حال کا موازنہ کرتی رہتی تھی۔ اور مستقبل کے متعلق خیالی گھوڑے دوڑا دوڑا کر پریشان، اُداس اور کبیدہ خاطر ہو جانا اس کا معمول تھا۔

بیشک، یہ اس کا معمول ہی تھا۔ اُسے تنہائی میں روتے دیکھ سکنے کا موقعہ تو خیر مجھے نہیں ملا۔ لیکن اس ایک سال کے عرصے میں کہ جب تک حالات نے ان لوگوں کو ایک طرح سے میرے ساتھ باندھے رکھا، مجھے اس کے لبوں پر حقیقی مسکراہٹ کے آثار کبھی دکھائی نہیں دیئے۔ کبھی کبھی انوپم کی خوشنودی کی خاطر یا اس کے بار بار اصرار پر وہ بمشکل مسکراتی تھی۔ لیکن جیسے وہ مسکراہٹ نامکمل ہو۔ ایک طرح کا اضطراب ایک قسم کا ترحم تھا کہ اس کے ہونٹوں کو احاطے میں لے لیتا تھا۔ اور انوپم نیلا کی اس سربستہ مسکراہٹ پر خوش ہونے کی بجائے اور بھی غمگین ہو جاتا۔

انوپم ...... نیلا کا بھائی۔ انتہائی حلیم الطبع اور منکسر المزاج شخص تھا۔ ہر کسی کو خواہ وہ پہلی مرتبہ ہی اس سے متعارف ہو رہا ہو۔ وہ اپنا ہمدرد و غمگسار سمجھنے لگتا تھا۔ اور اس سے اپنے دل کی تمام تر باتیں بے کم و کاست کہہ ڈالتا تھا۔ اگر اس کی زندگی کے ساتھ پرما سے بھاگنے کی داستان وابستہ نہ ہوتی اور اس نے بنگال کے قحط اور اس کے بعد ہندو مسلم فسادات میں ناقابلِ تلافی نقصان نہ اٹھایا ہوتا تو اُس کی باتوں، اُس کے لب و لہجہ

سے کوئی بھی شخص اس کے بلا کا چتر اور کائیاں ہونے کا فتوٰی دیئے بغیر نہ رہ سکتا۔ پہلے پہل جب اپنے لئے کرائے پر مکان حاصل کرنے کی غرض سے وہ میرے کلکتہ کے ایک دوست کی سفارشی چھٹی لیکر مجھے ملا تھا تو خود میں نے بھی کچھ ایسا ہی اندازہ لگایا تھا کہ اس شخص کو دروغ گوئی میں کمال حاصل ہے۔ جنگ کے دنوں میں لوگوں کے برما سے بھاگنے، دورانِ سفر میں سینکڑوں صعوبتیں اُٹھانے، بنگال کے قحط اور فسادات کی سینکڑوں باتوں سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ لیکن جن خونیں واقعات کی تفصیل اس نے بیان کی، اور جس طرح کہتے کہتے ایک گہرا سانس لینے کی خاطر وہ درمیان میں ایک آدھ لمحے کے لئے رک جاتا تھا......... یہ سب کچھ ممکن ہے....... اس خیال کے باوجود مجھے اس کی باتوں پر یقین نہ آتا تھا۔ لیکن اسے جھوٹ بولنے کی عادت نہ تھی، رفتہ رفتہ مجھ پر واضح ہوتا گیا....... ہو سکتا ہے برباد و بے خانماں ہو جانے کے بعد کاری اور ناگہانی مصیبتوں کا سامنا کرتے کرتے ہی اس کی زبان نے عاجزانہ اصرار سیکھا ہوا ور وہ جو، ہر کسی کے آگے بچھ سا جاتا تھا اس کی تہہ میں بھی لاچاری اور محرومیت کے جذبات کارفرما ہوں۔ جو بھی تھا اس کی ان دنوں کی زندگی میں فریب کو قطعی دخل نہ تھا۔ بلکہ محرومی کے ان احساسات نے اس کی خودی کو کچھ اس طرح مسخ کر ڈالا تھا کہ خود اپنی ہی نظر میں وہ حقیر بلکہ ایک حد تک ذلیل دکھائی دیتا تھا۔

"ذلّت اب میرے لئے کوئی ایسی بڑی بات نہیں رہ گئی"......... اپنی مانڈلے سے بعد کی زندگی میں مختلف لوگوں سے کی گئی ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے جب وہ کہتا "اپنے علاوہ دُنیا کے ہر شخص کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنا توانسانی فطرت ہی میں شامل ہے۔ پھر لوگ اگر مجھے جھوٹا اور مکّار سمجھ کر دھتکارتے رہے ہیں

تو میں سمجھتا ہوں وہ حق بجانب تھے۔ آخر مجھے ان کے سامنے گڑگڑانے کا کیا حق حاصل تھا"...... اس وقت اس کی بے رعب شخصیت میں کتنا جلال پیدا ہوجاتا تھا۔ کتنی عظمت آجاتی تھی اس میں ...... مجھ سے جو کچھ بن آیا تھا، میں نے ان لوگوں کے لئے کر دینے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔ پھر بھی مجھے محسوس ہوتا...... اس کی باتیں میرے مغرور دل کو شرمندہ کر رہی ہیں۔ لیکن وہ اگر دھتکارا گیا تھا۔ اسے ذلتیں اُٹھانا پڑی تھیں تو محض نیلا اور چندرا کی خاطر...... "نیلا اور چندرا"... بہنوں کی عدم موجودگی میں اس کے لہجہ میں اور بھی انکسار آشامل ہوتا "ان کے لئے مجھے اپنا آپ تک بیچ دینے میں بھی عار نہیں۔ پہلے ہی نہ جانے یہ کیا کہتی ہوں گی اپنے دلوں میں"۔

لیکن جہاں تک دلوں کی بات کا تعلق ہے چندرا کے دل کے متعلق مجھے اس سے قطعی اختلاف تھا۔ چندرا...... وہ غنچۂ ناشگفتہ جس کے ہونٹ چھپتی مسکراہٹ، اور بے موقع ہنسی سے ہمیشہ مرصع رہتے تھے۔ جسے نت نئی پوشاک پہننے کا ازحد شوق تھا۔ اور جو اپنے انتہائی شوخ رنگ کے کپڑوں میں اُگتا ہوا سورج سی بنی ہوئی گویا ہر وقت اپنے میں نئی جوانی نئی زندگی محسوس کیا کرتی تھی، بلاشبہ اس گھر کی رونق بلکہ اس گھر کی روح تھی۔ میں سوچتا ہوں نیلا کی وہ پیچیدہ فلسفیانہ باتیں جو دستائی کے ذریعے ظہور پذیر اس کے وہ عجیب وغریب مگر صداقت سے مملو تجربات اعتقادات چندرا کی لمحہ بھر کی مسکراہٹ کے سامنے کس قدر ہیچ تھے۔ زندگی کی صداقت کو نیلا نے نہیں چندرا نے پایا تھا۔ چندرا جو، ہر حال میں مسکراتی تھی، جسے فلسفے سے دُور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ جسے خودستائی سے چڑ تھی۔ اور جس کے

لئے کچھ بھی سوچنے کی بجائے زیرِلب کچھ نہ کچھ گنگنانا زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔

"کیا نیلا نے شروع زمانے ہی سے اس طرح کی خاموش طبیعت پائی ہے؟"

انوپم سے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ماںڈے میں ان تینوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جیسا کہ ان دِنوں دکھائی دیتا تھا خود اس نے کبھی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دی تھی اور نوکروں چاکروں کی تو بات ہی کیا گھر کے آدمی تک اس سے گھبراتے تھے۔ کبھی کوئی بات اس کے ناموافق نہیں ہوئی کہ قیامت آجاتی۔ نوکروں کے علاوہ بہن بھائیوں میں سے بھی کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ آج تک اس نے چھوٹے صاحب کی چپت یا مکّے کا مزا نہیں چکھا۔ چھوٹے صاحب .... انوپم وہاں "چھوٹا صاحب" تھا اور ننھی رانی، یعنی چندرا تو خیر ان دِنوں بالکل بچّہ ہی تھی۔ بارہ تیرہ برس کی عمر ہوتی ہی کیا ہے۔ اسے تو اپنی ہمجولیوں، اپنے کھیل کود ہی سے فرصت نہ ملتی تھی ....." ہاں نیلا"...... نیلا کے بارے میں کچھ کہنے سے پیشتر لمحہ بھر کے لئے اس کی آنکھوں میں ایک غیر متوقع سی چمک پیدا ہو جاتی....... "ان دنوں کی ہو بہو نیلا دیکھنے کے لئے آپ آج کی چندرا دیکھ لیجئے۔"

"آج کی چندرا" کتنا رومان کتنی دلفریبی تھی ان الفاظ میں..... آج کی چندرا۔ یعنی آج سے چار برس قبل نیلا کے ہونٹوں، نیلا کی آنکھوں سے بھی جذبات اور رنگ کے سوتے پھوٹتے تھے..... کیا اس کے رخساروں میں بھی جنگلی گلاب کے عطر بیز پھول کھلے رہتے تھے۔ اچھوتے اور معطر پھول! پھول جو اپنے آپ ہی پر اتراتے ہیں اور کیا اپنے ہی مسکرانے پر اسے ساری کائنات نغمے برساتی ہوئی محسوس ہوا کرتی تھی؟ مجھے یقین نہیں آتا۔ وہ ایک دوسری سے کتنی مختلف، کتنی دُور تھیں۔

آج بھی اگر میں ان دونوں شخصیتوں کو ایک دوسری میں حل کر کے کوئی علیحدہ انفرادی شکل دینا چاہوں تو میرا خیال ہے میں ناکامیاب رہوں گا۔ جیسے ایک زندگی کی ابتداء ہو اور دوسری انتہا۔ نیلا نے ابتدا، اور انتہا کا درمیانی فاصلہ کس قدر جلد عبور کر لیا تھا۔

"ہمیں کن کن مصائب سے گذرنا پڑا ہے" چندرا کو میرے ساتھ سٹ کر بیٹھتے، میرے کوٹ کا کالر کھینچ کر مجھے کرسی پر بٹھاتے اور ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی ہوئی نیلا اپنے ذہنی ہیجان کا ثبوت دینا چاہتی ...... "اس کا آپ اندازہ تک نہیں لگا سکتے"

بلاشبہ، میں نے ان کی مصیبتوں کا تہ دل سے اندازہ لگانے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ باوجودیکہ ان لوگوں کے لئے مکان تلاش کرنے میں مجھے کافی دوڑ دھوپ کرنا پڑی تھی۔ اور انوپم کو دوائیوں کی ایک فرم میں گذارے لائق جگہ دلوا دینے کے علاوہ میں ہر روز بلا ناغہ ان کے ہاں جا کر ان کی ضروریات کے متعلق پوچھ گچھ بھی کیا کرتا تھا۔ انہی کا ساہو کر ان کے ماضی سے لیکر اس وقت تک کی کھنچی ہوئی لکیر کو پیٹنا بھی ایک طرح سے میرا معمول بنا ہوا تھا۔ لیکن دراصل وہ سب کچھ بہت حد تک بناوٹی تھا۔ اور میں تو آج بھی اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ انوپم اگر نیلا اور چندرا کا بھائی نہ ہوتا تو کیا اس حد تک میری توجہ کا مرکز بن پاتا۔

اپنا زیادہ سے زیادہ وقت نیلا اور چندرا کی صحبت میں گذارنے کی خاطر میں نے ان دونوں کو پڑھانے کا بہانہ ڈھونڈا۔ انوپم خوش تھا کہ غالباً اس طرح نیلا کا دھیان بٹ جائے گا۔ وہ غمگین رہنا چھوڑ دے گی اور پھر جب رفتہ رفتہ

میں ۔ نے ان کے دل بہلا دے کا ڈھونگ رچا کر انھیں سنیماؤں، تھیٹروں، تفریح گاہوں وغیرہ میں بھی گھمانا شروع کر دیا۔ پھر تو انوپم کو جیسے میں نے مول ہی لے لیا۔ وہ کس طرح میرے احسانات کا بدلہ چکا سکے گا۔ اسے سمجھ نہ آتی تھی ...... ادھر مجھے کتنی راحت کتنا سکون حاصل ہوتا جب لوگوں کی گرسنہ نگاہیں چندرا ...... اس شہابِ ثاقب، اس حسن وشباب کے مرقع کی طرف بیساختہ اُٹھ جاتیں، جو اِن کی دسترس سے کہیں دُور میری بغل میں جلوہ افروز ہوتا تھا۔ اور جب کا میرے شانے سے شانہ ملا کر چلنا میرے احساسِ برتری کو انتہا کی حد تک نمایاں کرتا ہوا مجھے مغرور اور بے خود کئے دیتا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہی نہ رہتا کہ حسن وجمال کا ایک اور دفینہ میری دوسری بغل میں بھی موجود ہے کہ اگر دفینہ نہ ہوتا تو اس مجسّم نور کی چکا چوند بھی ماند پڑ جاتی اور یہ کہ انوپم کو اپنی بہنوں کی وساطت سے میرے احساسِ برتری کو نمایاں کرنے کی خواہش نہیں۔ بلکہ اس نے تو انھیں ایک دیوتا کی حفاظت میں چھوڑ رکھا ہے ایک ایسا دیوتا جو ان کے وسوسوں کا علاج کرے گا۔ اور جس کے خلوص اور خدا ترسی کی بدولت نیلا، جو اپنے اوٹ پٹانگ خیالات سے اپنے لئے جینا دوبھر کئے ہوئے تھی، مسکرانا سیکھے گی .... کاش وہ اس قدر سریع الاعتقاد واقع نہ ہوتا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ اس کی اس سریع الاعتقادی ہی کا صدقہ نہ تھا کہ اپنے دل کی ہزار جد وجہد، ہزار خواہش کے باوجود مجھ میں کوئی غیر معمولی قدم اُٹھانے کی جُرأت نہ ہوتی تھی۔ کیسا انوکھا حربہ تھا اس کے پاس، اپنے تئیں دوسرے کے رحم پر چھوڑ کر، اگلا کیا سلوک کرے گا، اس

طرف سے قطعی طور پر آنکھیں بند کر کے وہ کتنا نڈر کس قدر محفوظ ہو جاتا تھا۔

کلکتہ میں وہ لوگ تین برس تک رہے تھے لیکن ان تین برسوں میں اُنھیں ایک دن بھی سُکھ کا سانس لینا نصیب نہ ہوا تھا۔ حالات اگر سازگار رہتے تو وہ اپنی بہنوں کے بوجھ سے کب کا سُبک دوش ہو چکا ہوتا۔ برما سے بھاگنے کے دوران میں دس دس روپے کے عوض ایک ایک بسکٹ خریدنے کے باوجود اتنا اثاثہ بچ رہا تھا کہ وہ باآسانی اپنی بہنوں کے ہاتھ پیلے کر دیتا۔ لیکن وہ سب کچھ تو ان کے کلکتہ میں وارد ہوتے ہی بنگال کے مہیب قحط نے دبوچ لیا ــ "پھر بھی غنیمت ہے" وہ کہتا..... "جن دنوں چاروں طرف بھوک ہی بھوک منڈلا رہی تھی۔ لوگ چاول کے ایک ایک دانے کے لئے تڑپ تڑپ کر جان توڑ رہے تھے۔ ہم پر کبھی فاقے کی نوبت نہ آئی تھی۔ خدا خدا کر کے وہ بلا ٹلی....." اب وہ اپنی اس لاپتہ بہن کے ذکر کے لئے تمہید باندھنا شروع کرتا۔ "سوچا تھا، اپنا پیٹ کاٹ کر یا جیسے بھی ہوگا پانی کی کوڑی ہی درمیان میں رکھ کر چار چکر دلا دوں گا کہ ایک بالکل ہی انوکھی چیز سامنے آگئی۔ اس انوکھی شے سے جان و مال تو کیا عزت و آبرو تک محفوظ نہ تھی۔ پڑوسی پڑوسی کا گلا کاٹنے لگا۔ کل تک جب ہمسائے کی ماں بہن کو اپنی ماں بہن کہہ کر ایک اچھوتی مسرت اور تسکین حاصل ہوتی تھی۔ آج انہی ماؤں بہنوں کی بے حُرمتی فرض اولین بن گئی۔ مذہب کے جنون نے ایمان بدل ڈالے، اور ایمان بدلتے ہی ایک ایسا حشر بپا ہوا، ایسی قیامت آئی کہ......" لیکن اس سے آگے وہ کبھی کچھ نہ کہہ پاتا۔ بہنوں کی موجودگی اُسے اپنی آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو اندر ہی اندر پی لینے پر مجبور کر دیتی یہاں تک کہ اس کوششِ ضبط میں اُسے فقرے کو کسی دوسرے ڈھنگ سے

مکمل کرنے تک کی سُدھ نہ رہتی۔ وہ مسکرانے کی ناکام سعی کرنے لگتا لیکن نیلا
..... ہاں نیلا کو تو ہر وقت کسی ایسے ہی موقع کی تلاش رہتی تھی۔ بھائی کے اس
طرح خاموش ہو جانے پر اس کا جذبۂ سنافرت اور بھی مشتعل ہو اُٹھتا۔ پھر اس
.. کا آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر آہیں بھرنے کا پیہم دور سیلاب کی طرح اُمڈ کر درمیان
ہی میں رُکی ہوئی اس جوانی کے شعلہ جوالا بن جانے کی تڑپ! ..... مجھے گھبرا کر چندرا
کی نگاہوں میں پناہ لینی پڑ جاتی۔

"اس میں کچھ شک نہیں۔" چندرا کی ان پُرسکون، طمانیت بخش نگاہوں کی
شہ پا کر اکثر مجھے سُماجی بننے کی بھی سُوجھتی ......" اس قسم کی ہنگامی باتیں ہمہ گیری
کا دعوی کر سکتی ہیں اور ان سے زندگی کے بہتے ہوئے دھارے کا رُخ بھی وقتی طور
پر بدل جاتا ہے۔ لیکن در اصل یہ سب کچھ اتنی اہمیّت کا حامل نہیں جتنا کہ تم لوگ
سمجھتے ہو۔ مانڈلے میں آج زندگی پھر سے اُفتاں و خیزاں ہو اُٹھی ہے۔ لوگ جنگ
کی لعنتوں کو قریب قریب فراموش کر بیٹھے ہیں۔ اور ایک وقت آئے گا۔ جب
ان چند روزہ دُکھوں کے رہے سہے ہیولے بھی حرفِ غلط کی طرح مٹ جائینگے
بنگال بھی وہ بنگال نہیں رہا۔ جس کو آپ نے دیکھا تھا۔ جہاں کی زمین نے چاول
جننے سے انکار کر دیا تھا۔ اور جہاں کے آسمان نے انسان سے بے رُخی اختیار
کر لی تھی۔"

"لیکن آج کل وہاں کیا ہو رہا ہے۔" حالات حاضرہ کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے نیلا یکایک کہہ اُٹھتی۔" آج جبکہ وہاں کی زمین دریا دل ہو گئی ہے اور آسمان
نے انسان پر اپنی شفقتوں کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ یہ انسان کا انسان پر

جھپٹنا۔ یہ غارتگری، یہ درندگی۔ ہم کس قدر خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ یہ جنگ کیوں ہوتی ہے یا اگر جنگ نہیں ہوتی تو وبائیں کیوں پھوٹ پڑتی ہیں۔ قحط کیوں پڑ جاتے ہیں ایک انسان دوسرے انسان کو جانوروں کی طرح ذبح کرنے پر کیوں تل جاتا ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے..... کیوں ہے؟"...... لیکن نیلا کی اس قسم کی کسی بات کا جواب دینے کی بجائے میں پھر چندرا کی طرف دیکھ کر ہلکا سا مُسکرا پڑتا۔

چندرا بدستور مسکرا رہی ہوتی تھی۔ نہ انوپم کی ڈبڈبائی آنکھیں، نہ نیلا کی غمگین صورت کوئی بھی اُس سے اُس کی وہ مسکراہٹ نہ چھین سکتا تھا۔ ان یاقوتی ہونٹوں کی وہ دلآویز مسکراہٹ بلکہ ایسے موقعوں پر تو اس کی مسکراہٹ میں اور بھی کئی لطافتیں پیدا ہو جاتی تھیں۔ ایک طرح کا تسلی بخش فخر ہوتا تھا۔ ایک ایسا دلربایانہ انداز گویا وہ میرے دل میں نیلا کے بوئے ہوئے اس کانٹے کو نکال پھینکنا چاہتی ہو گویا کہنا چاہتی ہو..... مجھے نیلا سے، نیلا کی ہر بات سے انتہائی نفرت ہے وہ اسی لئے اُداس اور رنجیدہ رہتی ہے۔ کہ ابھی تک اس کی شادی کیوں نہیں ہوئی۔ وہ بیاہ نہیں کرائے گی۔ اس کی ان باتوں کو میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اسے میرا آپ کے ساتھ ہنسنا بولنا ازحد ناگوار گذرتا ہے میں اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی...... بھلا میں کیونکر اپنے ہونٹوں کو سی لوں۔ کیسے ساکت وصامت بیٹھی بیوقوفوں کی طرح بسیط خلا میں جھانکتی رہوں..... یہ عارضہ ...... لیکن کچھ بھی کہنے کی بجائے اس کے ہونٹ کچھ اس طرح پھڑک کر رہ جاتے کہ مجھے محسوس ہونے لگتا وہ ہونٹ بڑی شدت کے ساتھ ایک طویل بوسے کے مُتمنی ہیں۔

لیکن بوسہ ....!!

وہ ان لوگوں کا لاہور میں رہتے ہوئے آٹھواں مہینہ تھا جب ایک دن یکایک ۔ انوپم کے سر پہ یہ بھوت سوار ہو گیا کہ وہ جلد از جلد دونوں بہنوں کی شادی کر دینا چاہتا ہے ۔ کوئی سے دو لڑکے ...... چاہے غریب گھر کے ہوں ۔ چاہے ان کی اکیلی جان ہو ۔ وہ ذات پات کے جھمیلوں میں بھی نہیں پڑے گا...... اور اپنے مخصوص انداز سے یہ اہم کام بھی اس نے مجھی پہ چھوڑ دیا ۔ کہنے لگا ۔" جہیز وغیرہ دینے کی ہمت مجھ میں نہیں پھر بھی ضروری اخراجات کے لئے میں نے ان آٹھ مہینوں میں پانچسو کے قریب روپے جمع کر لئے ہیں ۔" اگرچہ دبی زبان سے اقرار وہ اس بات کا کر رہا تھا کہ نیلا اور چندرا کی عمر شادی کی عمر سے تجاوز کر رہی ہے ۔ لیکن در اصل یہ فوری ارادہ چندرا کے جسم کی پکار یا نیلا کی روز بروز ڈھلتی ہوئی جوانی کی اُپج نہ تھا بلکہ خود اس کی اپنی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کا بہانہ تھا ۔ معتبر ذرائع سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اپنے دفتر ہی کی ایک اینگلو انڈین لڑکی سے راہ و رسم بڑھا رہا ہے ۔ بات راہ و رسم ہی تک محدود نہ تھی وہ اکٹھے ہوٹلوں، سنیماؤں میں بھی آنے جانے لگے تھے ۔ اور وہ اس کے ساتھ وعدہ بھی کر چکا تھا کہ سر سے بہنوں کا بوجھ اُتارنے کے فوراً ہی بعد وہ اس سے شادی کرے گا ...... اور میں دیکھتا آ رہا تھا کہ کس طرح چند ہی دنوں میں بیزاری اور تھکن کا وہ ابدی سلسلہ جس سے اس کی شخصیت ناقابلِ فہم سی بنی ہوئی تھی روز بروز معدوم ہوتا جا رہا تھا ۔ اس کی جگہ جوشش اور جدوجہد نے لے لی تھی ۔ خود اعتمادی اور فراموشی کا سنگم ...... ایک جذبہ جو دبا ہوا تھا اور دوسرا جو دبتا نہ تھا ۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ اس دن کے بعد اس کی زبان پہ شادی ہی

کبھی اپنے والدین، اپنے بھائیوں کی اموات اور اپنی اس گمُ شدہ بہن کا ذکر آتا تھا۔

"سچ مچ انسان کس قدر ناشکر گذار ہے" کسی غیر متر قبہ شے کا تصور باندھتے ہوئے اب، وہ اپنی مسرت کا اظہار کرنا چاہتا..... " میں تو سمجھتا تھا کہ تا عمر مجھے اطمینان نصیب نہ ہو گا"۔

لیکن اطمینان اُسے کیا نصیب ہوا تھا۔ شادی کے نام ہی سے جو غیر معمولی ردِ عمل چندرا، اس جوانی کے تبسم میں رُونما ہوا جس والہانہ وارفتگی سے وہ متعارف ہوئی اور جب غیر مانوس تعیش کے عناصر اس کے انگ انگ سے پھُوٹنے لگے۔ ان سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی نسائیت صدیوں سے ایک ایسی ساعتِ خوش کُن کی منتظر تھی۔ یہی وہ مطالبہ تھا جس کے لئے اس کے ہونٹوں نے بے وجہ، بے موقع ہنسی کا غلاف اوڑھ رکھا تھا۔ اسُ مسموم ماحول میں بے معنی اور بے مقصد طور پر مسکراہٹیں بکھیرتے پھرنا اور اس ہنسی کے نتائج سے لاپرواہ آج تک جو وہ الھڑ اور بے باک بنی ہوئی تھی۔ اس کی جگہ اسے ایک ایسی چپ لگی اور اس نے کچھ اس طرح اپنے آپ ہی سے شرمانا شروع کر دیا کہ میں حیران تھا...... یہی وہ چندرا ہے ...... جسے شاید ہنسی کے علاوہ دوسری ہر بات ممنوع اور معیوب معلوم ہوتی تھی...... مگر اس کے ساتھ ہی جب میں نیلا کا ذکر کرتا ہوں تو مجھے یک گونہ افسوس ہوتا ہے۔ کاش کہ اس کے اس مبُہم رویے میں بھی کوئی تبدیلی رُونما ہو سکتی وہ خوفناک، خوفزدہ آنکھیں کچھ مانگنے کی بجائے برابر کچھ پوچھتی ہی رہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ سب کیوں ہے؟ یہ مضحکہ خیز سترتیں۔ یہ پُر اسرار عزائم ...... تلخیوں اور بے پناہیوں سے فرار کے مسدُود راستے......، اور خدا...... وہ صرف تحقیر آمیز

بیزار کُن ہنکارا بھر کر رہ جاتی۔ خلا میں گھورنے کا انداز اُس نے کچھ ایسا بنا لیا تھا گویا وہ کسی خاص نقطے پر اپنی آنکھیں مرکوز کرنا چاہتی ہو۔ خلا میں سے کچھ سونگھنا چاہتی ہو........

ان دنوں بڑی شدت کے ساتھ یہ احساس میرے دل میں چٹکیاں لیا کرتا تھا کہ عورت کے حُسن کی وہ قوتیں جن کا اثر بے پناہ گنا گیا ہے، کس طرح مایوسی رنج اور تفکر میں ڈوب کر اپنی تمام نُدرت کھو دیتی ہیں۔ افسوس کہ نیلا کے لئے شادی ایک مہلک ترین مذاق تھا۔

لگاتار ایک مہینے کی کھوج کے بعد انوپم خدا کا شکر بجا لایا جب ایک شام اُس نے مجھ سے کہا کہ نیلا کے لئے اس نے بَر منتخب کر لیا ہے جس لڑکے کا ذکر اس نے کیا وہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ پرلے درجے کا اوباش، ان تمام خصلتوں کا مالک جنھیں متوسط طبقے میں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ اپنی بات پر اَڑا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ نیلا خود بخود اُسے سنوار لے گی۔ پھر اس زمانے میں سب گُن پورے لڑکے ایک کوڑی تک کا جہیز نہ لینے کی شرط پر مل سکنا تو ناممکنات میں سے ہے۔ مجھ سے جو بن آئے گا، ماتھا ٹیک دوں گا......... خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ قسمت پر بھی اس کا ایمان مستحکم ہو چکا تھا۔

لیکن افسوس کہ قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔

لاہور کے ہندو مسلم فسادات میں انوپم کا وہ ہونے والا بہنوئی ان چند پہلے اشخاص میں سے تھا جنھیں سر راہے ہلاک کیا گیا تھا۔ سُکھ چین کی نیند کے بعد ایک صبح جب لوگوں کی آنکھ کھلی تو عجیب واویلا مچا ہوا تھا۔ چند ہی گھنٹوں میں سنسنی

خوف وہراس کی حدیں عبور کر کے ایک ایسی پُر اسرار وحشت سے ہمکنار ہوگئی جہاں پہنچکر انسانی محسوسات شکستہ و ریختہ ہو جاتے ہیں۔ ذہن بالمقابل تک کی سچائی سے مُنکر ہونے کا بہانہ ڈھونڈتا ہے۔" ہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے؟" آدمی اپنے آپ ہی سے سوال کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ کامل وثوق کے ساتھ کہہ سکے "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا" لیکن جو کچھ ہو رہا تھا اس کی داغ بیل تو نہ جانے کب سے ڈالی جا چکی تھی۔ راکھ کے نیچے ہی نیچے سُلگتی ہوئی چنگاری شعلوں کا رُوپ دھارنے کے لئے غالباً ہوا کے کسی بھولے بھٹکے جھونکے کی منتظر تھی کہ جھونکا..... پنجاب کے باشندوں نے ان ہولناک مناظر کو فرطِ حیرت سے دیکھا کہ کل تک وہ جن کا گمان تک نہ کر سکتے تھے اور جنھیں وہ بنگال، بہار اور بمبئی کے لوگوں کی سفر وضہ روئیداد دل پر محمول کرتے تھے لیکن پھر وہ ایک دوسرے کے کان میں کہنے لگے۔ پنجاب کے ہندو کس سے ہیٹے ہیں۔ پنجاب کا مسلمان بھی لڑنا مرنا جانتا ہے۔ بہتوں کا خیال تھا کہ یہ چند دہشت پسند غنڈوں کی کرتوتوں کا نتیجہ ہے اور پنجاب کی کڑی پولیس انھیں ایک دو روز ہی میں کچل کر رکھ دے گی۔ لیکن افسروں کی ہزار کوششوں کے باوجود چنگاری شعلے کی صورت اختیار کرتی گئی۔ کشت وخون کا بازار روز بروز گرم ہوتا چلا گیا.... آج ایک قوم کے بیس افراد آگ میں زندہ جھونک دیئے گئے تو کل دوسری قوم کے پچاس اشخاص کو چھروں سے ہلاک کر دیا گیا۔ اخباروں کی سُرخیاں خون آلود ہوگئیں ہندوؤں نے مسلمانوں کو کیا سمجھ رکھا ہے یہ مسلمان ہندوؤں کو کیا سمجھتے ہیں۔ سرگوشیاں ہوتیں، دھمکیاں دی جاتیں، چھرے چاقو چمکتے، تلواریں لہراتیں، بم پھٹتے اور آگ کے شعلے یہاں وہاں آسمان کی خبر لانے لگتے۔

پھر اتحاد و امن رکھنے کے بیسیوں طریقے رائج ہوئے کہیں ہندو مسلمانوں کے گھروں کا پہرہ دے رہے ہیں تو کہیں مسلمان ہندوؤں کو اپنے گھروں میں پناہ تعصب، تفریق سے بالاتر امن کمیٹیاں بنیں۔ تباہ حالوں کی امداد کے لئے مشترکہ کام ہوئے۔ لیکن وہ تمام سمجھوتے، سبھی تسلیاں چند ہی دنوں میں بیکار ہو کر رہ گئیں۔ پڑوسی کا پڑوسی پر سے اعتماد اُٹھ گیا۔

ہندوؤں کو شکایت تھی کہ پولیس مسلمانوں کے ساتھ مل کر نہتے اور بے گناہ ہندوؤں پر گولیاں برسا رہی ہے۔ وہ کس سے لڑیں۔ مسلمان نالاں تھے کہ حکومت ہندوؤں کی سرپرستی پر کمر بستہ ہے انہیں کھل کھیلنے کا موقع نہیں ملتا۔ بس لڑنے اور کھل کھیلنے کے لئے انھوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ اب نہ کوئی دہشت پسند تھا نہ کوئی غنڈہ۔ صرف 'ہندو' رہ گئے تھے یا محض 'مسلمان'...... وہ ہندو ہے مارو کافر کو...... یا علی...... وہ مسلمان ہے، مارو ملیچھ کو..... بجرنگ بلی اور علی اور بجرنگ بلی کافروں اور ملیچھوں کی خاک و خون میں لت پت لاشوں کو شمار کرتے ہوئے اپنے نام لیواؤں کے دل میں ہر لحظہ جرأت اور شجاعت پیدا کرتے جا رہے تھے۔

چند ایک ہوش رُبا سانحے تو میں نے آنکھوں سے دیکھے تھے خصوصاً وہ منظر مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ جب مخالف مذہب کے ایک غنڈے نے دوسرے مذہب کی ایک حاملہ عورت کا سرِ راہ پیٹ چاک کر دیا تھا اور پانچ مہینے کی عمر کا وہ لوتھڑا فاسد مادے کی صورت میں اس کے پیٹ میں سے اُبل اُبل کر تارکول کی جھلستی ہوئی سڑک پہ بہہ رہا تھا..... آج بھی جب میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم جاتا ہے

تو میرے جسم کے کل رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔ سیاست سے لیکر بنی نوع انسان کے مخفی جذبات تک میں ہر چیز کا جائزہ لیتا ہوں ۔ مذہب اخلاق ، تہذیب ، تمدّن اور تاریخ پر نگاہ دوڑاتا ہوں انسان اور انسانیت کا ارتقا .... صدیوں سے پروان چڑھتی ہوئی زندگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ! یہ جور وستم یہ خونریزی یہ موت کی سی پراسرار کیفیتیں کیوں ..... یہ آتشیں تغیرات چہ معنی دارد ....!

" مانڈلے پر جاپانیوں کی بمباری سے کلکتہ کے وہ ہتھیار بند غنڈے کہیں زیادہ خطرناک تھے جو پلک جھپکنے کی دیر میں نہ جانے کہاں سے نمودار ہو جاتے تھے ۔ شاید انھیں زمین اُگل دیتی تھی یا وہ آسمان پر منڈلا رہے ہوتے تھے تہ خانوں سے لیکر آٹھ منزلہ چھتیں تک ان کی دسترس سے محفوظ نہ تھیں " ...... انویم کا ماضی پھر سے اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ بیدار ہو اُٹھا .... ماضی کی جس ذلّت اور آوارگی کی زندگی کے متعلق چند ہی روز پہلے اس کے دل میں جو تحقیر آمیز بیزاری پیدا ہوگئی تھی ۔ آج وہی زندگی پھر سے اُسے مشعلِ راہ کا کام دینے لگی ...... اور میں حیران تھا کہ اپنی اس چاہت ، اپنی اس پہلی محبت کا گلا اس نے کس بیدردی سے گھونٹ دیا ہے ..... وہ اپنی محبوبہ سے ملاقات کا کوئی نہ کوئی ذریعہ بخوبی نکال سکتا تھا لیکن اس نے گھر سے باہر قدم نکالنے کی جیسے قسم کھالی تھی .... " اب کیا ہوگا .... متفکر اور متحیر ہر وقت وہ یہی سوچتا رہتا ...... " شاید اس دفعہ .. .... " حسبِ عادت اپنے اس طرح کے فقروں کو نامکمل چھوڑ دینے ہی میں اُسے بہتری دکھائی دینے لگی ۔

لیکن بہتری برائی سے قطع نظر نیلا بضد تھی کہ اس دفعہ وہ اپنے آپ کو وقت اور حالات کے رحم پر چھوڑ دیں ...... ناحق پریشان ہونے سے حاصل ...... جو ہوگا دیکھا جائیگا۔ اس کی ان دنوں کی حالت کے پیش نظر میں حیض بیض میں پڑ جاتا ہوں۔ سچ مچ کس قدر حیرت کا مقام تھا کہ ماضی کی گئی، بیتی باتوں پر ہر وقت دل شکستہ اور مغموم رہنے والی نیلا۔ نیلا، کہ جس کے متعلق میرا خیال تھا کہ کوئی معمولی سے معمولی صدمہ سے بھی اس کے لئے مہلک ثابت ہو سکتا ہے اس کا دماغی توازن بگڑ جائے گا۔ اس کے لئے جیسے یہ کوئی اہم بات ہی نہ تھی۔ میں جب اسے سینکڑوں کی تعداد میں طرح طرح کی اذیتوں سے قتل کئے گئے انسانوں کی باتیں سناتا تو اس کے لبوں پر عجیب، مبہم سے خطوط کھنچ جاتے وہ خطوط مسکراہٹ کے خطوط نہ تھے۔ نہ زہر خند، نہ طنزیہ بلکہ ان میں ایک ایسی فتح کا احساس مضمر ہوتا تھا جو دلگیر اور تلخ ہونے کے باوجود تفکر اور تشویش سے مبرا ہوتا ہے ... رنگ لاتی ہوئی قیاس آرائیاں آدمی کو اپنے ذہن کی رسائی پر متحیر کر دیتی ہیں ...

"کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا ....." آج سے آٹھ ماہ پہلے ہی کسی بھی غیر معمولی طوفان کا اندازہ لگانے والی نیلا مایوسی رنج اور تفکر میں ڈوبے ہوئے الفاظ استعمال کیا کرتی تھی۔ "یہ خاموشی یہ سکون کس قدر مضحکہ خیز ہے" اور رہ رہ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگنا بھی غالباً اسی بات کا حامل تھا کہ وہ فضا میں روز افزوں اس کا اندازہ لگایا کرتی تھی۔

چند ہی دنوں میں حالت بد سے بد تر ہوگئی۔ سارے صوبے ہی میں آپا دھاپی بھگدڑ مچ گئی تھی۔ بغیر کسی منزل کے کسی نامعلوم محفوظ جگہ کی تلاش میں

خاندان کے خاندان گھروں کو خیرباد کہہ کر ادھر اُدھر بھٹکنے لگے اور وہ لوگ جو حوادث کا شکار ہو گئے تھے۔ جن کے پاس تن کے پھٹے پُرانے چیتھڑوں کے علاوہ کچھ باقی نہ رہ گیا تھا۔ جن کی جائیدادیں لوٹ لی گئی تھیں۔ جن کی نوجوان بہو بیٹیوں کو زبردستی چھین لیا گیا تھا اور جن کے منہ میں مفتوں سے ایک کھیل تک اُڑ کر نہ گئی تھی ایک ایسی نفرت ایک ایسے اشتعال کا سرچشمہ بنے ہوئے تھے کہ ساری قوم کٹ مرنے پر آمادہ نظر آتی تھی۔

وہ وسیع الخیالی، وہ فطری یگانگت کے جذبات جن کے بغیر انسان مکمّل نہیں گردانا جا سکتا ــــ جن احساسات اور محسوسات کو انسان کی زیبائش کے لئے ہزاروں صدیوں نے ہزاروں رہنماؤں، دیوتاؤں اور پیغمبروں کو جنم دیا تھا اور جن رہنماؤں دیوتاؤں اور پیغمبروں نے خدائے سمیع و بصیر کو پالینے کا صرف اور صرف ایک ہی نعرہ بلند کیا تھا۔ جو ایک ہی آواز میں پکارتے تھے۔ جن کے قول و افعال میں ہم آہنگی تھی۔ اور جنھوں نے نجات کے خواہاں انسان کو نجات کے ایک ہی صحیح و متوازن راستے پر ڈالنے کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا تھا.... ... دل و دماغ میں سمائی ہوئی انہی دیوتاؤں پیغمبروں کی ہدایات سے انسان دانستہ طور پر منکر ہو گیا تھا۔ ان کی ہستی نیست و نابود کر دینے ہی پر شاید انسانی فتح کا انحصار تھا۔

اور اب تو انسان اور انسانیت، اخلاق و مذہب کی بھی بات نہ رہ گئی تھی ہندوستان کی تقدیر پلٹنے کا زرّیں موقع تھا۔ صدیوں کے غلام ملک کو نجات مل رہی تھی۔ پھر سیاست کے بالمقابل اور پھر ایک غلام ملک کی سیاست کے بالمقابل انسان و انسانیت، اخلاق و مذہب کی

وقعت ہی کیا ہے۔ سیاست بھی تو جنگ ہی کا دوسرا نام ہے اور جنگ میں کہاں کا انسان کیسی انسانیت، اخلاق کس بلا کا نام ہے۔ آزادی کے موقع پر خون کی ہولی نہ کھیلی گئی تو پھر کونسا ایسا موقع آئے گا۔

چندرا نے بہن اور بھائی کی باتوں پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے اظہارِ افسوس کیا اور ان کی غیر موجودگی میں صاف اور کھلے لفظوں میں مجھ سے شکایت کی کہ انوپم کی نظروں میں تو ہماری آبرو کوئی وقعت ہی نہیں رکھتی۔ آخر لاہور سے ہجرت کرنے والے سبھی لوگ تو نا سمجھ، ناعاقبت اندیش نہیں۔ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اور آنے والے جن دنوں کا لوگ قیاس کرتے ہیں، اگر وہ سب کچھ بے معنی و بے مطلب ہو تو بھی ہمیں یہاں نہ رہنا چاہیئے۔ میں کیوں انوپم کو مشورہ نہیں دیتا...... یہ الفاظ چندرا کے دل کی پیداوار ہیں اور چندرا کا لہجہ اس حد تک افسردگی کو اپنا سکتا ہے، یقین کرتے وقت مجھے کافی کوفت ہوئی اس کے ساتھ ہی پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ نیلا آج سے چار برس قبل سب سے پہلے کس قسم کے احساسات سے ہمکنار ہوئی ہوگی۔ اور مجھے یہ اندازہ لگانے میں بھی چنداں دقت نہ پیش آئی کہ عورت کی زندگی کا آبِ حیات کس وقت اور کن حالات میں زہرِ ہلاہل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ نیلا کے دل میں اپنے بھائی انوپم کے متعلق کس قسم کے خیالات جاگزیں تھے لیکن ان دونوں بہنوں کی جداگانہ فہم کے باوجود اتنا میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ دونوں ہی انوپم کی ہر بات، ہر حرکت کو کسی غیر معمولی سازش پر محمول کرتی تھیں۔ اور انھیں تعجب اور افسوس تھا کہ ان کے مستقبل کے بارے میں وہ

کیوں کوئی فوری فیصلہ نہیں کر ڈالتا ۔ خود میرے تئیں بھی ان کے دل میں ایک بے بضاعت قسم کی نفرت پیدا ہوگئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری وہ تمام دوستانہ دلجوئیاں وہ تشفی آمیز خیالات اب قطعی طور پر اپنا اثر زائل کر چکے تھے ۔ جس باقاعدگی اور کوشش کے ساتھ میں نے ان کا بہی خواہ بننے کا جتن کیا تھا ۔ جن مقید اور مغلوب تمناؤں کو میں نے تاریکی اور تعفن سے نکالنا چاہا اور جن متبسم نگاہوں اور دلکش مسکراہٹوں میں اشتیاق آمیز شوخی کے ساتھ ساتھ دلآویز سکون کا رنگ بھرنے کی جدوجہد کی تھی اور ان تمام مساعی کی بدولت میں اپنے ذہن میں وجدآور کیفیت کا جو ایک مسلسل ، ایک پیہم دور لانے کا خواہاں تھا اب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں اب میرے لئے وہاں کوئی دلچسپی نہ رہ گئی تھی ۔ دونوں بہنوں کے چہرے میری ذات ، میرے خیالات میری فہم ، میرے جذبات کا بالواسطہ یا بلاواسطہ مضحکہ اُڑاتے تھے ۔ شاید کوئی پوشیدہ ترغیب انھیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہو یا انھیں ہر وقت اپنے دل میں کسی آنے والی غیر معمولی مُصیبت کا واضح عکس دکھائی دیتا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو کچھ بھی تھا مجھ سے وہ بدظنی کی حد تک نالاں تھیں ۔

اور میں نے بھی ان کے ہاں آنا جانا ترک کر دیا ۔ جب میں نے دیکھا کہ خود انوپم کا طرزِ عمل بھی موافق نہیں رہا ۔ میرے ساتھ اس کا جو برتاؤ اِن دنوں رہا اسے اگر میں سرد مہری نہ کہنا چاہوں تو بے رخی ضرور کہہ سکتا ہوں ۔ اگرچہ اس کے چہرے پر ایسی کوئی علامت دِکھائی نہ دیتی تھی ۔ پھر بھی چونکہ اس نے اپنی بہنوں ہی کی طرح غیر معمولی خاموشی اختیار کر لی تھی اور میری آمد پر وہ رسماً بھی خوشی کا اظہار نہ کرتا تھا ، میں نے ان سے غیر متعلق رہنے کا فیصلہ کر لیا ۔

پورے چھ روز تک میں ان کے ہاں نہ گیا۔

اس دن میں اپنا سامان بندھوا رہا تھا۔ اب صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ہزاروں لاکھوں دوسرے بے خانماں لوگوں کی طرح میں بھی اپنے آباؤ اجداد کی وراثت کو چھوڑ کر اپنی "قوم" کے لئے مقرر کردہ ملک میں چلا جاؤں۔ میرے لئے اب وہاں کوئی جگہ نہ تھی ...... ہر کسی کی طرح مجھے بھی اپنی قوم کے لئے مقرر کردہ ملک میں خوشی اور خوشحالی کا دور دورہ دکھائی دے رہا تھا۔ آزادی اور نصرت کا مخزن، میری آمد کا منتظر میرا ملک ......

لیکن میرا ملک بہت، وسیع وعریض ہے۔ میں کہاں جاؤں گا میرے اس وسیع وعریض ملک میں بھی کیا میری ہی طرح "دوسرے ملک والوں" کو اُن کے آبا واجداد کی وراثت سے محروم کر دیا گیا ہے کیا وہاں بھی آزادی کی خوشی میں خون کی ہولیاں کھیلی گئی ہیں۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کئے گئے ہیں۔ نوجوان لڑکیوں کو پکڑ پکڑ کر ان کے ساتھ زیردستیاں کی گئی ہیں معصوم بچوں کے سروں کو نیزوں پر ٹانگا گیا ہے ...... میں دل ہی دل میں دانستہ طور پر اس حقیقت سے منکر ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی نے باہر دروازے پر دستک دی۔

"دہلی میں آپ کا کوئی نہ کوئی دوست ضرور ہوگا۔" انوپم نے کمرے میں وارد ہوتے ہی اپنے مخصوص، پُرعجز ...... ایک برس پہلے کے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "اس سلسلے میں، میں آپ کی مدد کا طلب گار ہوں۔ اپنے کسی دوست کے نام مجھے ایک رُقعہ ......"

رخصت کے وقت انھیں الوداع کہنے کے لئے میں ان کے ہاں گیا۔

انوپم بدستور میری نوازشوں کے گُن گاتا رہا۔

چندرا نے طفلانہ اشتیاق کا نامکمل سا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے دہلی آنے کی دعوت دی۔

البتہ نیلا خاموش تھی۔ نہ جانے کس شے کا تحفّظ اس کے پیشِ نظر تھا رخصت کے وقت تک وہ برابر خاموش رہی۔ صرف ایک مرتبہ، صرف ایک ثانیہ کے لئے..... جیسے وہ کہنا چاہتی ہو...... اس نے عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

اس نے کچھ ان نگاہوں سے میری طرف دیکھا میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

پسپائی

وہ تصویر اُسے پسند تھی۔ ہر رات سونے سے قبل چارپائی کے سرہانے کی جانب دیوار پر لٹکے ہوئے اس سہ رنگے آئل پینٹ میں وہ ڈوب سا جاتا۔ متواتر دیکھنے کی خاطر وہ چارپائی پر اس طور سے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاتا۔ جیسے کسی خدائی امداد کے لئے عبادت کر رہا ہو۔ بعض اوقات تو یہ تسلسل اس حد تک طول پکڑ لیتا کہ اس کی بیوی اُکتا کر بڑ بڑانا شروع کر دیتی اور چونکہ بڑ بڑا چکنے کے بعد بے طرح اپنی قسمت کو کوسنا اس کا معمول بن چکا تھا اس لئے یہ نوبت آنے سے پیشتر ہی وہ اس کے تیور بھانپ کر بے دلی سے جماہیاں لیتا ہوا چارپائی پر لیٹ جاتا۔

یُوں اس تصویر میں کوئی ایسا عنصر نہ تھا جسے خاوند کے یُوں دیکھنے پر بیوی کے وقار کی تذلیل ہوتی یا وہ کسی غلط فہمی ہی میں مُبتلا ہو سکتی۔ مگر یہ بات

اس کی قوتِ برداشت سے باہر تھی کہ آنکھوں کے سامنے اس کا خاوند دُنیاداری کی باتوں کو تلانجلی دیکر یُوں سمادھی لگائے بیٹھا رہے۔ صحت کے گر جانے، صبح جلد نہ اُٹھنے، اور دفتر جانے میں دیر ہو جانے وغیرہ کے کئی بہانے تراشتی، دُنیا جہان کے خاوندوں کی نیک خصلتوں کا تذکرہ کرتی۔ اس بُری گھڑی کو کوستی جب وہ تصویر گھر میں لائی گئی ہوگی۔ اور ہر حربے کے ناکام ہونے پر جونہی اپنے پُھوٹے نصیبوں پر ٹسوے بہانے کو تیار ہوتی، وہ جماہیاں لینی شروع کر دیتا۔

بیٹے کو اس تصویر کی طرف اس اشتیاق سے دیکھتے ہوئے دیکھکر اکثر اس کی ماں ایک گہرے سانس کے ساتھ کہنا شروع کر دیتی ——— "تمہارے پتاجی کی یہ نشانی ان دنوں کی یادگار ہے۔ جب ہم پر بُرے دن آئے تھے۔ اور وہ دن تو ایک خدائی قہر ہی تھا۔ گھر میں تنکا تک توڑ کر منہ میں ڈال لینے کی سبیل نہ تھی کہ گھر والا اس بے کار سی شے پر جبیں جھاڑ آیا۔"

"بیکار سی شے" اور وہ سوچنے لگتا۔ خدانخواستہ اگر اس کے والد مرحوم کُل کنبے کی بھوک پر اس بیکار سی شے کو ترجیح نہ دیتے تو ورثہ میں سونپی ہوئی اُن کی دوسری نعمتیں ہرگز ہرگز اس کی توجہ کا مرکز نہ بن پاتیں۔ یہ ذات، اور برادریوں کے جھمیلے۔ چھوٹی بڑی ناک، ماں، بہن، بیوی، ان کے خالی پیٹ اُن کے رُلانے ہنسانے کی ذمہ داری ——— زندگی میں، زندگی کے لئے لمحاتی سُکون، وقتی راحت کس قدر لازم ہے۔ صرف ایک ثانیہ کہ انسان کل غموں کو پچھاڑ کر کسی فانی یا غیرفانی شے میں کھو سکے۔

ہر رات اس تصویر کو دیکھ چکنے کے بعد وہ اپنے آپ میں ایک غیرمعمولی ردِعمل

محسوس کرتا۔ دن بھر کی سر توڑ مشقت، افسروں کی گھڑکیاں، بیوی کی ننگی بچی حالت، ساٹھ روپے میں ماں کے سینکڑوں جوڑ توڑ، ہنھ آتی ہوئی بہن ان جھنجھٹوں سے پیدا شدہ ذہنی پریشانیاں ــــ وہ ہر الم کو بھول جاتا۔ آنے والا کل صد ہا مسرتوں اور راحتوں کا پیغام لیئے اُسے اپنا خیر مقدم کرتا ہوا دکھائی دینے لگتا۔ اس میں ایک نئی زندگی، نئی طاقت بھر جاتی۔ ماضی، حال اور مستقبل اُسے اپنے ہاتھوں گھڑے ہوئے گیلی مٹی کے کھلونے سے معلوم ہوتے جنھیں جس وقت اور جس طرح چاہتا وہ توڑ مروڑ کر نیا بنا سکتا تھا۔ اس وقت اُسے احساس ہی نہ رہتا کہ یہ پشتم پشتم گذرتے ہوئے دن کیونکر تیر ہو رہے ہیں۔

یُوں تو دن بھر اس کے ذہن میں عجیب افراتفری مچی رہتی تھی۔ مگر تصویر کی طرف دیکھتے ہی اس کی تمام پریشانیاں شدید تر ہو اُٹھتیں۔ دن بھر کی کارگذاری اور گئے بیتے دنوں کی کئی باتیں عجیب عجیب ڈھنگوں سے اس کے حافظے کی تختی پر اُبھرنا شروع ہو جاتیں۔ خواہ مخواہ کی ہنر بچّی سے اکثر اُسے ندامت بھی ہونے لگتی۔ اور وہ اپنے اُوپر جھنجھلا بھی اُٹھتا ــــ بھلا اسے کیا جو چار سال لبے شنکر نے پہلی بیوی کو چڑ چڑی کہہ کر چھوڑ دیا۔ اور دوسری شادی رچالی ــــ مگر وہ روبرو کی ہر بات سوچنے کا عادی تھا جس طرف اس کی بچار دھارا بہہ نکلتی وہ ہتوا تو اسی طرف مُڑے رہتا ــــ مگر ایک ہی سال میں دوسری بھی پُرانی ہو گئی ہے۔ دونوں ہر دوسرے چوتھے، وہ شور شرابا مچا دیتے ہیں کہ محلہ بھر کے لوگوں کا ناک میں دم ہے۔ بیوی میکے سدھارنے کی دھمکی دیتی ہے تو میاں تیسرا بیاہ رچانے کا طعنہ۔ پہلی سہاگن تو

جیسے آئی گئی ہوگئی۔ اس دن چچی سے کہہ رہی تھی، ماں! یہی جی چاہتا ہے کہ کچھ کھا کے سو رہوں۔ چچی نے پچکارا، دلاسہ دیا تو لگی پھوٹ پھوٹ کر رونے۔ اتّی سی تو اس کی عمر ہے۔ سنہ ماتھا بھی کچھ بُرا نہیں جو کوئی نقطہ نکالے۔ اس پر مزاج میں وہ انکسار اور حلم کہ دشمن بھی رام ہوں۔ ظالم مجھے بھائی کہہ کر پکارتی ہے ورنہ —— ذرا سی دیر کے لئے رُک کر وہ پھر خیالات کی رو بہہ جاتا۔ مگر کچھ بھی نہ کہہ کر پکارنے والیوں کے لئے بھی تو میں کوئی کام کی شے نہیں۔ وہ اپنے سیٹھ مرشد پرشاد ہی ہیں۔ صبح کام پر جانے کے لئے نکلتا ہوں تو ان کی نئی نویلی پانچویں دلہن اپنے پانچ منزلہ مکان کی درمیانی منزل کے جھروکے سے ہر روز مجھے تاکتی ہے — اُسے آئے دو مہینے ہو گئے۔ پر کیا مجال جو ایک بھی ناغہ ہوا ہو۔ آنے کے دوسرے دن ہی سے اس نے یہ تاک جھانک شروع کر دی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ کی چھنگلیا میں ہیرے کی انگوٹھی کی چمک خواہ مخواہ میری آنکھوں سے بھڑ جاتی ہے۔ لاکھ اوپر نظر نہ اُٹھانے کے ارادے باندھوں لیکن گلی کا موڑ کاٹتے ہی جانے بوجھے جی میں کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔ پھر یہ سوچ کر کہ دیکھوں شاید آج وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔ جونہی پلٹ کر نظر گھماتا ہوں کہ ہیرے کی انگوٹھی کی چمک اتنی دُور سے بھی آنکھوں میں کوند جاتی ہے۔ اور وہ اس کا گہرے سُرخ رنگ کا دوپٹہ یوں ہوا میں لہرا رہا ہوتا ہے گویا پُرمعنی انداز میں اپنے رنگ کی پوری تشریح کے ساتھ الوداع کہہ رہا ہو۔ سُنا ہے سیٹھ ہر دُلہن کو یہی انگوٹھی پہناتا چلا آ رہا ہے۔ چار مر چکی ہیں۔ بال بچہ کوئی ہے نہیں۔ لاکھوں پر ہاتھ ہے۔ بس یہی ایک آرزو ہے کہ اولاد کا منہ دکھائی

دے توجیون سپھل ہو۔ سر کے بال پک کر جھڑنے شروع ہو گئے ہیں۔ منھ میں اپنا دانت ایک بھی نہیں۔ چلنے ہیں تو پاؤں کی لڑکھڑاہٹ سے لٹکتے ہوئے جبڑوں میں جھریاں ناچا کرتی ہیں۔ سو کیا ہوا۔ ساہوکار جو ہیں۔ لوگ کہتے ہیں سیٹھ "منگلیک" ہے۔ اس پر بھی بڑے سناتن دھرمی اپنی لاڈلیوں کو سیٹھ کے پلّو سے باندھ کر پچکار پچکار کر کہتے ہیں۔ جا بیٹی راج بھوگ۔ اور اپنے دل میں خوش ہوتے ہیں کہ ہم بھی اب تیری وجہ سے راج بھوگیں گے —— کاش کہ یہ نئی دُلہن ہیرے کی جھوٹی سچی قیمت کا اندازہ کئے بغیر اس انگوٹھی کو اتار پھینکے۔ کوئی نہیں مانے گا۔ مگر میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سیٹھ کی ہر دُلہن یہی انگوٹھی چاٹ چاٹ کر مری ہے۔ مگر میں یہ سب کچھ کیوں سوچتا ہوں۔ بھلا میرے سوچنے سے کیا ہو سکتا ہے۔ میں ہر روز دفتر جاؤں گا۔ وہ ہر روز مجھے تاکے گی اور کچھ دنوں کے بعد وہ تاکنے کا کوئی اور ہی وقت مقرر کرے گی۔ شاید وہ بھی ہیرے کی انگوٹھی کو چاٹ لینا پسند کرے گی مگر اسے اُتار پھینکنا نہیں۔

خیالی گھوڑے دوڑا دوڑا کر وہ پریشان ہو جاتا۔ سامنے کی تصویر اُسے دُھندلی دُھندلی دکھائی دینے لگتی۔ اپنے ذہن کو جھٹک کر وہ نئے سر سے اُس پر نظریں گاڑ دیتا۔ کاش اس تصویر میں بھی —— کہ فوراً ہی بعد پھر اس کا ذہن ایک طرف لڑھک پڑتا اور اس کی قوتِ فکر پوری طاقت سے اسی جانب منتقل ہو جاتی —— دفتر کا بھی کیا جھنجھٹ ہے۔ چند منٹ کی دیر بھی تو قابلِ معافی نہیں سمجھی جاتی۔ عجیب پریشانی ہے دوڑا ہوں چڑرا ہوں میں خواہ مخواہ ایک آدھ منٹ ضائع ہو جاتا ہے۔ گھوڑا گاڑیاں، موٹریں، ٹرام سبھی بھاگے

جارہے ہوتے ہیں سبھی جیسے بے چین ہیں، پریشان ہیں، آہ، کبھی اُن جانے ہی میں انہیں گھوڑا گاڑیوں، موٹروں، ٹراموں کی پریشانیوں میں میری پریشانیاں دم توڑ دیں۔ مگر یہ سوچنے کی بھی تو مہلت نہیں ملتی۔ دیر ہو چکی ہے ــــ صاحب خفا ہوں گے۔ عجیب پریشانی ہے۔ دس سے سات بجے تک رجسٹروں، فائیلوں اور ریکوں میں غرق رہتا ہوں۔ یوں کام کرنے کا وقت تو دس سے چھ تک ہی کا ہے اس دن چھوٹے صاحب نے میرے چند منٹ دیر سے آنے پر آدھے دن کی تنخواہ کاٹ لی۔ کتنے ظالم ہوتے ہیں یہ حیثیت والے۔ جی میں تو بارہا آئی تھی کہ بڑے صاحب کے سامنے جاکر رونا روؤں۔ غریب آدمی ہوں مائی باپ جان مارتا ہوں۔ مزدوری پاتا ہوں۔ آج کل تو ویسے ہی پیٹ کاٹنا پڑ رہا ہے۔ مگر ہمّت نہ ہوئی۔ من ہی کو مارا کہ بڑا صاحب تو ہر خوشی غمی کے موقع پر ایک ہی فقرہ چُپت کر دیتا ہے ــــ او ٹُم ہندوستانی بہت روٹا ہے ــــ یہی کہے گا اور ہنسے گا۔ ہندوستانی بولنے کا اُسے اس قدر شوق چرایا ہے کہ موقع بے موقع جب بھی کوئی رونا رونے کی بات اُٹھتی ہے۔ وہ یوں چبا چبا کر اس فقرے کو دہرانے لگتا ہے گویا اس میں کوئی لاگ لپیٹ نہیں کہ ہندوستانی بہت روتے ہیں۔ کاش اسے یہ فقرہ سکھانے والا ہندوستانیوں کو رُلانے والوں کے بارے میں بھی کوئی ایسا ہی فقرہ سکھا سکتا کہ جس میں کوئی لاگ لپیٹ نہ ہوتی۔

خیالات کی یہ روانی اٹوٹ ہو جاتی۔ ایک طرح سے وہ اپنے وجود ہی سے بے خبر ہو جاتا۔ گویا ریاضت آخری مرحلے تک جا پہنچی ہو اور روح جسم کے کرشمے دیکھنے میں مگن ہو۔ اسے یہ احساس ہی نہ رہتا کہ دراصل ان تمام تصویروں کا اہم

کردار وہ خود ہے۔ اپنے دل پر بیتنے والی ہر بات کو تماشا بنا کر وہ ایک تماشائی بن جاتا۔ تماشہ بنی ہوئی ہستی اُسے مضحکہ خیز دکھائی دیتی۔ مگر وہ دیکھے جاتا۔ دفتر کی گھڑی بھی شاید میری ہی طرح پریشان رہتی ہے۔ جو مسلسل گردش سے اکتا کر کبھی کبھی رُک جاتی ہے۔ ہر آٹھویں دن اُسے چابی سے چند چکر دیئے جاتے ہیں اور مجھے ہر مہینے چند سکّے ہم دونوں میں محض یہی تو فرق ہے کہ اس کے چکر آسانی سے بڑھائے جا سکتے ہیں اور میرے سکّے گھٹائے۔ میری اُکتاہٹ کی طرح شاید اس کی اُکتاہٹ میں بھی بغاوت کی آمیزش ہوگی۔ مگر اس کے رُک جانے سے اس کا وقت ملا دیا جاتا ہے اور اُسے پھر سے چابی دے دی جاتی ہے۔ لیکن میرے رُک جانے سے میرا وقت کاٹ لیا جاتا ہے۔ وہ بھی چلتی ہے۔ میں بھی چلتا ہوں۔ پریشانیاں اور اکتاہٹیں ہوں گی۔ بغاوتیں بھی ہوں گی۔ مگر ہم شاید اسی طرح چلتے رہیں گے۔ نہ وہ زیادہ دیر رکنا پسند کرے گی اور نہ میں زیادہ دیر رُک سکوں گا —— دفتر کے باقی کلرک بھی میری طرح پریشان ہیں یا نہیں، یہ میں نہیں جانتا۔ مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ صاحب اس بات سے ضرور پریشان رہتے ہیں کہ چھ بجے کے بعد یہ کلرک لوگ کیوں دو گھنٹے کام نہیں کرتے۔ چھُٹی کا وقت قریب آتے ہی کام کے متعلق ہدایتیں دیتے ہوئے بار بار گھڑی کی طرف دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ سمجھتے ہوں گے ان ہندوستانی کلرکوں کے خیال میں ہمارا گھڑی کی طرف یوں بار بار دیکھنا وقت کی پابندی ظاہر کرتا ہے، مگر نہیں صاحب، ہم ہندوستانی خوب سمجھتے ہیں، ایک ساتھ گھڑی اور ہماری طرف دیکھنے کا مفہوم کلّی طور پر یہی ہے کہ یہ گھڑی اور تم! —— یہ گھڑی تو دن رات کام

کرتی ہے۔

صاحب چونکہ انگریز ہیں اور انگریز صفائی پسند ہوتے ہیں۔ اور چونکہ صفائی پسند افسر کے سامنے صفائیاں پیش کرنے کے بجائے صاف رہنے ہی سے وہ خوش رہتا ہے۔ اس لیے افسروں کی خوشی کی خاطر میں ساٹھ روپے میں سے تین روپے نقد دھوبی کے کھاتے میں جمع کرنا نہیں بھولتا۔ باقی رہے ستاون، سات روپے مکان کا کرایہ اُٹھ جاتا ہے۔ گھر میں چار آدمی کھانیوالے ہیں۔ بارہ روپے کا آٹا درجہ دوم۔ چار سوا چار کا بناسپتی گھی۔ چھ روپے کے قریب لکڑی ـــ مہنگا نہ پڑتا تو شاید کوئلہ ہی جلتا۔ چاول، دال، ساگ، نمک، مرچ، تیل، بھنگی نائی آخر کس کے بغیر گذر رہے۔ ہر مہینے نئے سرے سے مدیں تیار کرتا ہوں۔ مگر ایک کوڑی کا ہیر پھیر نہیں ہوتا۔ چھوٹے صاحب کی تنخواہ میری تنخواہ سے بیس گنا ہے۔ آٹھ سو روپے ماہوار پانے والے کی تنگدستی کے پیش نظر بڑے صاحب کی سفارش سے ہیڈ آفس نے اسے ایک سو روپیہ ترقی دی اور مجھے خزانچی اور حالات کی پیشین گوئی نے ایک روپیہ ترقی کا دلاسہ ـــ یہ ایک روپیہ چھوٹی بہن کی شادی کے لئے ماں علیحدہ رکھا کرے گی۔ مجھ سے وہ کہہ چکی ہے ـــ کہیں سے پانچ سات کی کوئی ٹیوشن مل جائے تو رات دو گھنٹے دے دیا کروں ـــ عینک کا نمبر بدلوانے کا ارادہ تھا۔ سواس بار بڑی بہن سسرال سے ایک اور پریشانی لیکر لوٹی۔ بیوی کے کنگن تک جو بچاری کے پاس سب گہنوں میں سے بچ رہے تھے "جمبنی" دینے کی خاطر اُٹھ گئے۔ بہن کہتی تھی ننھے کے ماتھے پر رام ہے۔ میں شرط باندھتی ہوں۔ اس بار ضرور دس روپے ترقی ہوگی۔ بہن کہے جا رہی تھی۔

اور ہنسے جارہی تھی۔ پھر یہ کہہ کر رونے لگی کہ آج اگر پتاجی زندہ ہوتے تو ——
نہ رو میری بہن! میں تمھارے ہنسنے اور رونے کا مطلب بخوبی سمجھتا ہوں۔
تمھارا یہ برسرِ روزگار بھائی خود کو بیچ کر بھی تیرا اوتھ پورا کرے گا۔ تمھیں ساس
اور نند کے طعنے نہ سننے دے گا۔ روتی ہے، پچھی پچھی، جب تک میرا دم ہے تیرا
میکا گھر قائم ہے۔ پرماتما ننھے کی عمر دراز کرے۔ لو اب ہنس دو کہ تمھارے
بھائی کو دس روپے ترقی ملنے والی ہے۔ نہیں کوئی بات نہیں، جب ترقی ہوگی تبھی
عینک کے نمبر بھی بدلواؤں گا —— اب کی تنخواہ میں سے تو دس روپے جو
پیشگی لے چکا ہوں وہ کٹ جائیں گے۔ یہ بھی صاحبوں کی نوازش ہی ہے جو آڑے وقت
میں ہاتھ نہیں سکوڑتے۔ ورنہ دُنیا منھ پر تھوکنے لگے۔ سالا سمبندھی کی بہن کی شادی
ہو۔ بلاوا آئے منھ دکھانے کو تو جانا نہ تھا۔ خود میرے بیاہ میں وہ گیارہ روپے
نقد تنبول میں گنوا گیا تھا۔ اصول اور قاعدے کے مطابق چاہیئے تو یہ تھا کہ میں
اکیس دیتا۔ مگر میں نے پانچ ہی روپے لڑکی کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اور سمبندھی سے
کہہ دیا۔ غریب آدمی ہوں قبول کرو، لڑکی کا بیاہ ہے، میری باہیں حاضر ہیں۔
لیکن اس پر تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ یوں ٹکر ٹکر میری طرف گھورنے لگا تھا
گویا کہنا چاہتا ہو، باہیں تو میرے پاس بہت تھیں۔ تمھیں تو باہوں کے بجائے
باہیں پیدا کرنے والی شے کی خاطر سندیس بھیجا تھا —— اسے اس بات سے کوئی
سروکار نہیں کہ اس بار جمع خرچ کے کھاتے میں دھوبی کے تین روپے کے ہندسے
چھ آنے کے دیسی صابن میں بدل جائیں گے۔ اور مہینے بھر میں صرف چار بار ڈاڑھی
منڈوائی جائے گی —— دولھا کی بہن کس قدر خوبصورت تھی —— "لگا دیجئے آگ!"

—— اس نے کس عجیب انداز سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا —— سکھی سہیلیاں ساتھ نہ ہوتیں تو شاید —— شاید کیا —— بھلا براتیوں کو پیش کیے گئے سگریٹ کو دیاسلائی دکھاتے ہوئے کسی کی خواہ مخواہ کی مسکراہٹ دیکھ کر جو محض اسی خاطر بکھیری جا رہی ہو کہ براتی برسوں تک اس ضیافت کا تذکرہ کرتے رہیں اور جب کہ مسکرانے والا دیاسلائی اور ڈبیہ کو اس انداز سے پکڑے ہوئے ہو کہ ابھی آگ لگایا چاہتا ہے تو لڑکے والوں کی طرف سے کھانا کھانے آئی ہوئی لڑکیوں میں سے ایک اگر یہ کہہ دے کہ لگا دیجئے آگ تو —— بیاہ شادی کے موقعوں پہ تو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر مذاق ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ کس قدر حسین تھی۔ سمبندھی کے منہ میں خاک، جو اس کے متعلق پوچھتے ہی ایک تقریر جھاڑ دی۔ لڑکے کی بہن ہے۔ پارسال شادی ہوئی۔ شادی کے دوسرے ہی ماہ دو لھا میاں چل بسے باپ نے تین شادیاں کیں۔ بڑے بھائی نے پہلی بیوی کے مر جانے پہ لو میرج کر لی۔ بیوی کی زندگی ہی میں دوسری شادی کی دھمکیاں دیتا تھا۔ مگر یہ چھوٹا یہ بہت نیک ہے —— اور اس کے ساتھ ہی وہ کہنے لگا۔ اب میں چاہتا ہوں تم سو جاؤ صبح چار بجے کی گاڑی سے ہی جارہے ہو نا؟ آنکھ نہ کھلے گی۔ مجھے رات بھر جاگتے تو رہنا نہیں تھا۔ مگر وہ کیوں ہنس رہی تھی۔ کاش کہ وہ روتی، مگر اس سے کیا ہو جاتا۔ کم از کم اسے ہنسنا نہیں چاہیئے تھا۔ اس کا وہ سُرخ رنگ کا دوپٹہ اس پہ وہ چاندی کے تاروں کی میناکاری بجلی کی روشنی کے تلے کس غضب سے چمک رہی تھی۔ اور وہ اس کی آنکھوں کی مدہوش کن چمک، بالکل ہیرے کی چمک معلوم ہوتی تھی۔ یہ عورتیں کچھ نہ کچھ چمکانا کیوں پسند کرتی ہیں۔ ان کے

دوپٹوں پہ سُرخ رنگ کے بجائے کاسنی یا انگوری رنگ کیوں نہیں آتے ۔ بھائی کی شادی میں قہقہے بانٹتی ہوئی وہ ایک نیم اندھے کلرک سے چہلیں کرگئی ۔۔ ہونہہ ۔۔۔ !

اس کے خیالات میں ایک عجیب تندی و تیزی آجاتی ۔ اس کے ذہن میں کھدی ہوئی سڑک کبھی ایک ختم نہ ہو سکنے والی سیدھ اختیار کرلیتی اور کبھی ہر قدم پر دوراہے یا چوراہے میں بٹ جاتی اور نیم شعوری طور پہ وہ کسی طرف بھی ہولیتا کہ یکایک بیوی کا بڑبڑا اُٹھنا سد راہ بن جاتا ۔ یوں ایک دم رکاوٹ پیدا ہو جانے سے وہ جھنجھلا اُٹھتا ۔ اس کے جی میں آتا کہ وہ اُسے آڑے ہاتھوں لے لے ۔ مگر اپنی پریشانیوں کے پیشِ نظر اُسے کسی کو بھی پریشان دیکھنا گوارا نہ تھا آخر بیوی کی خوشی غمی کا بار اسی کے کندھوں پر تو ہے ۔ جسے بہرحال اُٹھانا ہوگا ۔ پھر ناحق کی تُو تُو مَیں مَیں سے حاصل ؟ وہ اس کے خلاف کبھی ایک لفظ بھی مُنہ سے نہ نکالتا ۔ فرض کی کوتاہی کے سامنے جی ہی جی میں کڑھنا اس کے لئے زیادہ اہمیت رکھتا تھا ۔ وہ خاموش بیٹھا رہتا اور بیوی بدستور بڑبڑاسے جاتی ۔ اس روک کے بعد اس کے سوچنے کی طاقت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر سی جاتی ۔ برابر کے باورچی خانے سے جو ماں اور چھوٹی بہن کے سونے کا کمرہ بھی تھا اسے ماں کی لمبی لمبی آہیں سُنائی دینے لگتیں ۔ اور اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس وقت بھی وہ دفتر کے راستے میں کسی چوراہے پر کھڑا ہے ۔ موٹریں ، ٹرامیں ، گھوڑا گاڑیاں ! .... چیخ پکار ۔۔۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھی تو نہیں آتی ۔ کیا مجال جو ٹس سے مس ہو جائے ۔ پتی بھگتی کا یہ عجیب تقاضہ ہے ۔۔۔ آہ ۔۔۔ ہ ۔ شادی سے

قبل میرے دل میں کیا کیا ارمان تھے۔ کیا کیا ناک نقشے ذہن میں اُبھر اُبھر کر
خوشگوار گرہستی کا نمونہ پیش کیا کرتے تھے۔ راستہ چلتے ہوئے ہر نوجوان اور
کمسن لڑکی کو میں عجیب عجیب انداز سے پرکھتا تھا۔ تخلیئے میں وہی صورتیں گیلی
مٹی کے بُت بن جاتیں۔ ہر بُت سے دِل پسند خد و خال اکھاڑ کر میں ایک علیحدہ
بُت کی تخلیق کرتا۔ دُنیا جہان کی خوبصورتیوں کا مُرقّع، وہ بُت ـــــ او حسن دِن
اس بُت کو اپنانے کا چرچا ہوا تھا، میں نے صاف لفظوں میں ماں سے کہہ دیا
تھا، ماں میں تو لڑکی دیکھ کر بیاہ کروں گا۔ کہنے لگی کیسی بھولی باتیں کرتے ہو بچّہ!
ہم خود بیٹیوں والے ہیں کل کلوتر اگر تیری بہن کو لوگ دیکھنے آئیں تو پھر ـــــ پھر
آج کل کی لڑکیاں تو ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہوتی ہیں۔ وہ زمانہ لد گیا جب
گاؤں میں ان پڑھ اور اُجڈ لوگ بستے تھے۔ اب تو ہر گاؤں شہر سے چار رتی
آگے ہے۔ گھر آئی لکشمی۔ ہک ـــــ ہا ـــــ آج تو تیرے باپ دادا کے نام پر رشتے
چلے آتے ہیں۔ تیرا ابھی ان لوگوں نے دیکھا ہی کیا ہے ـــــ پُرانی دھاک جمی ہے
اور کیا ہے ـــــ لاکھ روڑے اٹکیں، ہاں! مین تو یہی جانتی ہوں کہ سنجوگ بڑا
زور آور ہے ـــــ چہ چہ! میرا کیا ہے۔ آج مری کل دوسرا دن، پر اتنا ضرور
کہوں گی کہ کل کو جب میری آنکھیں مُند گئیں تو ـــــ اور اس وقت ساتھ کی
رسوئی میں اپنی بیٹی کو چھاتی سے لگائے، خود جاگتی ہوئی اور ہمیں سو جانے کی تلقین
کرتی ہوئی شاید وہ اسی بات پر کھانس کھانس کر آہیں بھر رہی ہے کہ کہیں
اس کی آنکھیں نہ مُند جائیں ـــــ اگر وہ بدستور اسی طرح رات رات بھر کھانستی
اور آہیں بھرتی رہی تو کچھ ہی دنوں میں ـــــ لیکن مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیئے۔

اس کے ہوتے ہوئے مجھے کسی قسم کی فکر نہیں ۔ وہ تو ایک سائبان ہے۔ مجھے پریشان دیکھ کر وہ خود کس قدر پریشان ہو جاتی ہے ـــ اے ہے، تم اپنا جی کیوں بُرا کرتے ہو؟ جب تک میں بیٹھی ہوں تمھیں ہلکان نہ ہونے دوں گی ـــ ماں، سچ مانو میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تو میرے بعد بھی بیٹھی رہے۔ مگر کیا کروں میری ہر چاہت تشنۂ تکمیل ہی رہتی ہے۔ یہی دیکھ میں اس لافانی تصویر کو دیکھنا چاہتا ہوں مگر نہیں دیکھ سکتا۔ دو گھڑی کا میلہ ہے۔ لیکن میلہ سنانے کے سبب جوڑنے والی طاقت یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ میں صبح وقت پہ دفتر حاضر نہ ہو کر برطرفی کا تسکین دہ پیغام جھولی میں بھر لاؤں ـــ میں نہ تو لمبے تنکر ایسا بے درد ہوں نہ مرشد پرشاد ایسا سیٹھ۔ ساٹھ روپے کی کلرکی ہے اور بہن کے ہاتھوں میں مہندی رچانے کی پریشانی۔ یہ تو پتا جی کا جگ جگ بھلا ہو جو بُرے حال میں بھی میرا تمھارا سب کا بھلا کر گئے۔ یہ چھٹکی ہوئی روح پرور چاندنی ـــ جھیل کے پُرسکون کنارے پر اُلجھے ہوئے بالوں والے کا ایک اُلجھی ہوئی لٹوں والی کو اپنے زانو کا سہارا دینا۔ آدھا بیٹھنا اور آدھا لیٹنا۔ یہ معرفت کی باتیں نہیں، میں سچ کہتا ہوں۔ اب میں تم لوگوں کو کیسے سمجھاؤں کہ لٹوں والی کی آنکھوں کی یہ غیر فانی چمک نئے نظام اور نئی زندگی کا درس دے رہی ہے۔ اپنے بائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے مضراب کے تاروں کو اس کے دائیں ہاتھ کا عجیب بھولے پن سے چھیڑنا ایک نیا راگ ہے۔ زندگی کا راگ، روح کا راگ، زندگی جو محض سانس لینے کا بہانہ بنی ہوئی ہے، روح جو جبر او رصبر کی حامل ہے۔ تمھارے لئے یہ بیکار سی شے ہوگی۔ مگر مجھے تو دُور جھیل کے پرلے کنارے پر سرگرم سفر

اس کارواں کے اونٹوں کے گلے کی گھنٹیاں مضراب کی لے میں ایک نئی موسیقی کو جنم دیتی ہوئی سُنائی دے رہی ہیں ـــــ موسیقی جس نے روحانی اور جسمانی جوڑ جوڑے ہوئے ہیں، جو ازل سے ابد تک لکیر کی فقیر رہنا گوارا نہیں کر سکتی۔ اس کارواں کی منزل کہاں ہے۔ کس گوہر نایاب کی خاطر کارواں بڑھا چلا جا رہا ہے۔ میں اس سے رابطہ جوڑنا چاہتا ہوں۔ مصوّر نے بھی کمال صفائی سے ان دونوں رُوحوں کے چہروں پر وہی نقش اجاگر کر دیئے ہیں۔ وہ مطمئن نہیں ہیں ـــــ میں بھی مطمئن نہیں ہوں ـــــ مضراب اور اونٹوں کے گلے کی گھنٹیاں ـــــ یہ نغمۂ آمدِ بہار..........

.......کہ اپنی قسمت پر پھڑ کا دیں بھیجنے والی لپک کر لیمپ بجھاتی ہوئی کہہ اُٹھتی ـــــ صبح اگر میں نے اس تصویر کو نہ پھاڑ ڈالا تو براہمن کی بچّی نہیں۔ اور وہ یہ سوچتے سوچتے سوجاتا کہ کہیں یہ براہمن کی بچّی سچ ہی تو نہیں کہہ رہی۔

گرداب

تمھارا شکوہ بجا ہے مگر حالات کی ستم ظریفیوں کے پیشِ نظر تین مہینے تو کیا اگر تین برس تک بھی میں تمھیں خط نہ لکھتا تو بھی کچھ اچنبھے کی بات نہ تھی۔ تم شاید اسے مذاق سمجھو۔ لیکن یہ میرا ہی جی جانتا ہے کہ تمھارے خط کا جواب نہ دے سکنے سے خود مجھے کس قدر ندامت ہوتی تھی۔ میں تمھیں کیا بتاؤں کہ ــــ لیکن نہیں، بہتر یہ ہوگا کہ پہلے میں تمھیں ان تمام واردات سے آگاہ کر دوں جو اس دوران میں میری تمام تر توجّہ اپنی طرف مبذول کئے رہیں اور جن کے کارن میں اس ناکردہ گناہی کا مستوجب ہوا۔ تمھیں شاید یاد ہوگا کہ اپنے پہلے خط میں مَیں نے سرسری طور پر اپنی جائے رہائش بدل لینے کے متعلق لکھا تھا اور اس وقت جب کہ میں ایک گھٹیا سے ہوٹل کے تنگ اور غلیظ کمرے میں بیٹھا ہوا تمھیں یہ سطور لکھ رہا ہوں خود مجھے اپنی گذشتہ تین مہینوں کی زندگی عجیب و غریب

سی معلوم ہو رہی ہے۔ وہ بھی کیا دن تھے ــــ کیا وہ ایک خواب ہی نہ تھا۔
خوابوں کے سے ماحول میں رہ کر اب مجھے حقیقت بھی خواب ہی دکھائی دینے لگی
ہے۔ خود وہ کئی مرتبہ کہا کرتی تھی کہ انسان کی زندگی سے خواب کیوں جُدا
نہیں کئے جا سکتے؟ آخر ایسے خواب دیکھنے سے حاصل جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ
ہو سکتے ہوں۔ خواہ مخواہ کی زود حسی آدمی کو اپنی ہی نظروں میں گرا دیتی ہے۔
میں سوچتا ہوں، وہ کس قدر پتے کی باتیں کہتی تھی۔ کم از کم اس کی اپنی ذات
پر تو یہ الفاظ ہو بہو پورے اُترتے تھے۔ اس کی ہر بات، اس کے ساتھ
گذرا ہوا ہر لمحہ مجھے اپنے نام کی طرح یاد رہے گا۔

وہ کون تھی؟ اس کے متعلق میں تمھیں زیادہ دیر باتوں میں اُلجھانا نہیں
چاہتا۔ اشارتاً تو میں نے اپنے پہلے خط ہی میں لکھ دیا تھا اور اب وضاحت
بھی کئے دیتا ہوں کہ محض اسی کی خواہش سے اس کا خاوند مجھے اپنے یہاں
اُٹھوا لے گیا تھا۔ یہ مجھے اس نے بعد میں بتایا کہ وہ سوچتی تھی کہ ان دنوں تو
بیوی بچّوں والے کو مکان ملنا ناممکنات میں سے ہے، میں نہ جانے کہاں
کہاں بھٹکتا پھرتا۔

میرا اُن کے یہاں جا رہنا کسی اسرار سے کم نہ تھا۔ اُس دن جب
اس کے خاوند نے بلا کسی تکلف اور تمہید کے مجھ سے آکر کہا کہ اگر مجھے کوئی مکان
نہ ملا ہو تو میں انہی کے ہاں جا رہوں تو مجھے اس کے اس ہمدردی جتانے پر
بہت تعجب ہوا تھا۔ اس سے پیشتر پڑوس میں رہنے کے باوجود میری اُس
سے رسماً تک بول چال نہ تھی۔ علاوہ ازیں یہ بات تو اور بھی حیران کن تھی کہ آخر

وہ مجھ ہی پر یہ عنایت کیوں کرنا چاہتا ہے۔ اس مکان میں اور بھی تو کرایہ دار بستے تھے اور مالکِ مکان کے تقاضے سے سبھی کو مکان چھوڑ دینا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ان کے مکان کی درمیانی منزل میں سیڑھیوں سے ملا ہوا ایک کمرہ خالی ہے۔ اس طرح آنے جانے میں بھی مجھے کوئی رکاوٹ نہ ہوگی جس دلجمعی اور سرپرستانہ لہجہ میں وہ مجھے یہ سب بتا رہا تھا میری حیرت بڑھتی ہی جا رہی تھی اور شاید میں اس سے کچھ پوچھ بیٹھتا لیکن اسی وقت جب ایک طرح کی بے نیازی کے ساتھ جیسے یہ کوئی غیر معمولی بات ہی نہ تھی، وہ مجھے اس بارے میں سوچنے کو کہہ کر جانے لگا تو میرے دل میں پیدا شدہ تمام شکوک ایکدم دُھل سے گئے۔ ذرا سی حیل وحجت کئے بغیر میں نے شکریہ کے ساتھ قبول کرلیا پچھلے چند دنوں کے وہ تلخ تجربات جو مکان کی تلاش کے سلسلے میں مجھے حاصل ہو چکے تھے مجھے رسمی طور پر بھی کچھ کہنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ پھر ایک غیر شادی شدہ شخص کے لئے — جس کی جیب بھی پورے مکان کا کرایہ ادا کرسکنے کا بوجھ نہ اُٹھا سکتی ہو یہ ایک خدائی امداد سے کم نہ تھی۔ لیکن مجھے اس بات کی تشویش ضرور تھی کہ شاید اس کے بیوی بچّوں کو میری خواہ مخواہ کی آمد ناگوار گذرے گی ...... ہو سکتا ہے چند روپوں کے عوض وہ بچّوں والے گھر میں سے کچھ جگہ کرائے پر اُٹھانا چاہتا ہو اور ایک ساتھ رہنے سے چونکہ واسطہ سروکار پڑنا تو لازمی امر ہے۔ اس طرح اگر انہی لوگوں کو میرا وہاں رہنا اکھرے گا تو یقیناً بہت بدمزگی ہوگی۔ لیکن میرا یہ خیال تو سرے ہی سے غلط ثابت ہوا کیونکہ میرے پہنچتے ہی جس بے پناہ ہمدردی سے اس کی

بیوی میرے ساتھ پیش آئی اس کی مجھے توقع تک نہ تھی۔ سامان اُٹھوا کر جب میں اُن کے ہاں پہنچا۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ بچے باہر گلی میں کھیل رہے تھے اور خاوند کام پر جا چکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کچھ اس طرح کھِل سی اُٹھی گویا میں ان کا کوئی روٹھا ہوا بھائی بند تھا جس کے ساتھ اب من سوتی ہو گئی تھی۔ بڑی احتیاط سے وہ میرا سامان اوپر اُٹھوا کر لے گئی اور بعد میں جس اشتیاق سے وہ اُسے جوڑنے سجانے میں میرا ہاتھ بٹانے لگی۔ میں اس سے شرمندہ ہوا جاتا تھا۔ کچھ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس سے پیشتر چونکہ میں کسی عورت سے اس قدر قریب نہ ہوا تھا فطری جھجک مجھ پر غالب آ گئی ہو ــــ اس نے میری ہر شئے کو ترتیب سے رکھنے کے لئے موزوں جگہ نکالی۔ کسی چیز کے رکھے جانے پر مختلف زاویوں سے اسے دیکھا پرکھا، پھر تحسین طلب نگاہوں سے جب وہ میری رائے دریافت کرنے کی خاطر میری طرف دیکھتی، کسی شئے کے غیر موزوں جگہ پر دھرے جانے کے باوجود میں اس کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہو جاتا۔ ایک چھوٹی میز اور ایک آرام کرسی جو بقول اس کے اُن کے ہاں فالتو پڑی ہوئی تھیں۔ لا کر میرے کمرے میں رکھ دی گئیں۔ حالانکہ جس کمرے سے وہ دونوں چیزیں اُٹھا کر مجھے دی گئی تھیں ان کے بغیر وہ جگہ خالی خالی نظر آنے لگی۔ اور جب باتوں باتوں میں اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ مجھے اپنے ہاں اُٹھوا لانے کا خیال بھی دراصل اُسی کے دل کی پیداوار تھی تو میں اس سے اور بھی بے طرح مرعوب ہو گیا۔

جتنی دیر وہ میرے کمرے میں رہی مجھ میں اتنی جسارت تک نہ ہوئی کہ اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکوں۔ مجھے اب وہاں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ تمام گھر

ہی میرا ہے۔ اس کمرے کو تو میں اپنی بیٹھک سمجھوں۔ اس کے خاوند نے کن الفاظ میں مجھے یہاں آ رہنے کو کہا تھا؟ میرے آجانے پہ اُنھیں بہت خوشی ہوئی ہے وغیرہ اس نے بیسیوں باتیں کہہ ڈالیں جن کا جواب میں ہُوں ہاں سے زیادہ نہ دے سکا۔ یہ ہمدردانہ لگاؤ! میں حیران تھا، وہ کچھ اتنے گئے بیتے نہ تھے کہ محض کرائے کی خاطر انھوں نے مجھے اپنے مکان کا ایک حصّہ کاٹ دیا ہو۔

سامان وغیرہ سے بنٹ کر اس نے مجھے کھانا کھانے کے لئے پوچھا مگر میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں صبح ہی کھا چکا ہوں۔ بصورت دیگر اگر وہ کچھ کھانے کو اُٹھا لاتی تو یقیناً میرے حواس بُری طرح مختل ہو جاتے۔ اس کے علاوہ میں بھی یہ نہ چاہتا تھا کہ اب میری وجہ سے انہیں کوئی اور تکلیف اُٹھانا پڑے بلکہ میں ہی اگر ان کے کسی کام آسکوں تو زیادہ اچھا ہو۔ لیکن اسی شام خاوند کی موجودگی میں اس نے پھر مجھے کھانا گھر پہ کھانے کو کہا۔ اور اس بات پہ زور دیا کہ اب آئندہ میں وہیں کھایا کروں کہنے لگی، یہ تو کبھی نہ ہوگا کہ گھر میں چولھا جلے اور آپ باہر ہوٹلوں میں الم غلم کھاتے پھریں۔ میرے انکار پہ تو ہنسی ہنسی میں اتنا تک کہہ گئی کہ اچھی بات ہے اگر آپ نہ کھائیں گے تو میں تمام کھانا اُٹھا کر رکھ دوں گی۔ خود اس کے خاوند نے بھی ایک طرح کے عجز کے ساتھ مجھے تاکید کرنا شروع کر دی کہ اب مجھے اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھنا چاہیئے۔ میں بیگانہ بن کر رہنا چاہتا ہوں۔ یہ سب وہاں نہ چلے گا میں عجیب شش و پنج میں پھنس گیا تھا۔ ان کے پہلے احسانات ہی میرے لئے بارِ گراں ہو رہے تھے۔ میں نے بہتیرے حیلے کئے ان کی مہربانیوں تلے دبا جا رہا ہوں بہت کچھ کہا لیکن انھوں نے ایک نہ مانی اور بالآخر جب اُنھوں

نے یہ بھی مان لیا کہ وہ اس کا عوضانہ خرچے کی صورت میں قبول کریں گے۔ تو رضامندی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

اس اتنی سی بات پر نہ جانے وہ کیوں اس قدر خوش ہوئی تھی، گویا اس نے کوئی مُہم سر کرلی ہو۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب فاتحانہ غرور کا عکس لرزاں تھا۔ ایسی بھی کیا خوشی ہے؟ اس کا یُوں لہک سا اُٹھنا، بھلے ہی وہ ان باتوں سے الگ تھلگ ہو۔ کچھ یونہی سوچنے کی ترغیب دیتا تھا کہ شاید اس کے دِل میں کسی معمولی سی فتح کا بھی سہارا نہیں۔ عورتیں فطرتاً حساس ہوتی ہیں۔ اگر میں کسی طرح بھی اس کی بات نہ مانتا تو یقیناً اُسے بہت دُکھ ہوتا۔

تم بخوبی اندازہ کرسکتے ہو کہ ایسی سہولتیں اور ایسا خوش گوار ماحول پاکر میں کس قدر خوش ہوا ہوں گا۔ تمھیں معلوم ہی ہے کہ پتاجی کی وفات کے بعد میں کس طرح دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں لیکن جو غیر معمولی ہمدردی اور پیار مجھے وہاں آکر حاصل ہوا میں مبالغہ سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ اپنے گھر میں بھی مجھے نصیب نہ ہوا تھا کون کسی کا یُوں خیال رکھتا ہے، جس طرح وہ میرے ساتھ پیش آتے تھے۔ ان کا رویہ از حد قابلِ تعریف تھا۔ وہ تو مجھے گھر ہی کا ایک فرد ماننے لگ گئے تھے۔ خاوند کی نسبت بیوی کا حُسنِ سلوک تو کمال کی حد تک بڑھ چڑھ کر تھا۔ اس کی شفقتیں تو مجھے مول ہی لے رہی تھیں۔ کوئی بھی بات ہو وہ مجھے پیش پیش رکھتی سبزی بھاجی تک میں میری ہی پسند چلتی۔ بلکہ بعد میں تو یہ اس کا معمول بن گیا تھا کہ جب تک وہ مجھ سے کسی سبزی کا نام نہ کہلوا لیتی کھانا ہی نہ بنتا۔ بعض اوقات کچھ یونہی تنگ سا آکر میں تین چار سبزیوں کے نام گن دیتا تو کھانے میں وہ

سب کی سب سامنے آجاتیں۔ بلاناغہ وہ میرے کمرے کو جھاڑتی پونچھتی۔ ہر شے
قرینے سے رکھتی کہیں کچھ الٹ پلٹ نہ کر دیں، اپنے بچوں تک کو وہ میرے
کمرے میں نہ آنے دیتی۔ بلکہ اس کی موجودگی میں بھی کبھی کوئی بچہ وہاں چلا آتا
تو وہ اس کے ساتھ ہی اُٹھ جاتی۔

شروع شروع میں چند ایک دن تو میں خود ہی اس سے دُور دُور رہا۔ اس
کی موجودگی میں میں ایک ناقابلِ بیان سی کش مکش میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ مجھ میں اس
سے بات تک کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ مگر جب وہ آپ ہی آپ میرے کمرے
میں آنے جانے لگی۔ اور یہ کہہ کر کہ وہ خود کو بہت تنہا تنہا محسوس کرتی ہے اس
نے کافی دیر تک میرے پاس بیٹھنا شروع کر دیا تو ہم بہت جلد ایک دوسرے
سے کھل گئے۔ میں ایک روزانہ اخبار میں رات کی ڈیوٹی دیا کرتا تھا۔ اس طرح
اس کے خاوند اور بچوں کے چلے جانے کے بعد دن بھر ہم اکیلے رہ جاتے تھے۔
رسوئی وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ میرے کمرے میں چلی آتی۔ بچوں کے موزے،
سوئیٹر یا دوسرا کاڑھنے بننے کا سامان وہ وہیں اُٹھا لاتی۔ درمیان میں چاہے
میں سو بھی جاتا وہ برابر وہیں بیٹھی رہتی۔

وہ بڑی ہنس مکھ اور لطیف الخیال عورت تھی۔ اس کے لب و لہجے میں
علم اور جذبات کی شدّت تھی۔ ایک طرح کی غنودگی تھی کہ اس کے اندازِ گفتگو میں
بسی ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں وہ مجھے اپنے گھر کے کئی ایسے قصّے بھی سنا ڈالتی جو کسی غیر
کے کانوں کے لئے نہیں ہوتے۔ اور تو اور ان کا کون سا رشتہ دار کس شہر میں
بستا ہے۔ کس گلی محلے میں ان کا گھر واقع ہے۔ وہ کیا کاروبار کرتے ہیں وغیرہ۔

چھوٹی چھوٹی باتیں بھی وہ مجھے کچھ اس طرح سمجھاتی جیسے اس کے رشتہ دار میرے کچھ لگتے ہوں اور اب ان کے ہاں میرا آنا جانا ایک لازمی امر کی طرح مجھ پر عاید ہوتا ہو۔

اس کی عمر تیس برس سے کچھ اوپر ہی ہوگی مگر دیکھنے میں وہ اس سے کہیں کم کی دکھائی دیتی تھی۔ جسم کی بناوٹ اور رنگ روپ کے لحاظ سے تو اس میں غیر معمولی جاذبیت اور دلکشی تھی۔ درمیانہ سا قد۔ سڈول مگر اکہرا بدن، وہ کچھ اس قسم کی عورتوں میں سے تھی جنھیں دیکھ کر کوئی بھی شخص ان کی جوانی کے دنوں کا تصور کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک نظر دیکھنے سے تو قطعی طور پر یہ اندازہ نہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ تین بچوں کی ماں تھی۔ لباس وہ نہایت سیدھا سادا مگر چست پہنتی تھی۔ کنواریوں کی طرح سفید کپڑوں سے اُسے زیادہ رغبت تھی۔ سفید ساڑھی یا سفید دوپٹے میں اس کا چہرا نہایت پاکیزہ اور کنوارے جذبات سے معمور نظر آتا۔ اس پر اس کی وہ کچے دودھ کی مانند سفید مسکراتی آنکھیں اور ہر وقت مائل بہ تبسم ہونٹ بجائے خود اس کی لہکتی طبیعت کے آئینہ دار تھے۔ ان سب کے مجموعی تاثر سے اس کی شخصیت کچھ اس طرح کی بارعب ہوگئی تھی کہ باتیں کرتے رہنے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی اس کی باتوں کا جواب دیتے نہ بن آتی تھی۔ کوئی بھی موضوع ہو وہ اس پر گھنٹوں بول سکتی تھی۔

برعکس اس کے اس کا خاوند غایت درجہ خاموش طبیعت اور پرانی وضع کا انسان تھا۔ شکل و صورت اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے بھی ان دونوں میں غیر معمولی فرق تھا۔ وہ نہایت نازک اندام تھی اور اس کے خاوند کا ہر عضو موٹا موٹا اور غیر متناسب

سا تھا۔ یہ آگے کو بڑھی ہوئی توند، ٹھگنا سا قد۔ اس پر جو اس کا پہناوا تھا اس سے تو رہی سہی کسر بھی پوری ہوجاتی تھی۔ لمبا کھلا کوٹ اور تنگ پائچوں کا پاجامہ پہن کر جب وہ چلتا تو اس کی چال پہ بھدّ کنے کا گمان ہوتا تھا۔ گول مٹول چہرا جس کے دونوں رخساروں کا پلپلا گوشت جبڑوں پہ سے لٹک کر گردن کے ساتھ بری طرح ہم آہنگ ہوگیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی اور گول ہی آنکھیں جن کی پتلیاں جھڑ جانے کے باعث ڈورے سُرخی مائل سفید ہوگئے تھے۔ گالوں کی طرف پھیلی ہوئی چپٹی سی ناک جس کے نتھنے ذرا سی مسکراہٹ پہ اور بھی چوڑے ہوجاتے لیکن شاید سر کے کھچڑی بال چھپانے کی غرض سے جو وہ پیچھے گردن اور آگے کنپٹیوں تک گٹھڑ سی پگڑی باندھے رکھتا تھا۔ اس کی صورت اور بھی مضحکہ خیز بن جاتی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب کبھی وہ میرے سامنے ہنس ہنس کر آپس میں باتیں کرتے تو مجھے بُرا بُرا سا محسوس ہونے لگتا۔ تم بھی اگر میری جگہ ہوتے تو یقیناً وہ خاص قسم کے محسوسات تمہارے دل میں بھی ایک عجیب و غریب قسم کی افراتفری مچا دیتے۔ شاید یہ انسانی فطرت ہی ہے کہ ایسے موقعوں پر چور کی طرح دل میں بیٹھا ہوا احساسِ برتری، بلاکوئی حد مقرر کئے اجاگر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ غیر اختیاری طور پہ اپنے آپ کو بدل میں پیش کرنے کی خواہش پیدا ہوجاتی ہے اور آدمی خواہ مخواہ سوچنے پہ مجبور ہوجاتا ہے کہ کیا اُسے 'وہ' پسند ہے؟ اور اگر ہے تو کیوں ہے یا یہ کہ نہیں ہونا چاہیئے۔

بظاہر ان دونوں کی جوڑی بالکل غیر موزوں تھی۔ لیکن جہاں تک میرے جاننے کا تعلق ہے انھیں آپس میں انتہائی محبّت تھی۔ یوں اگر دنیاوی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو خدو خال کی غیر موزونیت کچھ ایسی خاص بات بھی تو نہیں ہوتی۔ کوئی بھی عورت

کسی بھی ایسے شخص کی بیوی بن کر رہنا قبول کر سکتی ہے جو اس پر جی جان سے قربان ہو سکے۔ اس کی ہاں میں ہاں ملا سکے۔ شادی سے پہلے بیشک کسی قسم کے بھی خاوند کا تصور ذہن پر مسلط ہو لیکن جب عمروں کا سودا طے ہو جاتا ہے تو وہی خیالی ناک نقشہ، خاوند چاہے کیسا بھی ہو اسی میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ اور میرے خیال میں زندگی کی غذا پوری مقدار میں ملنے ہی سے اس کی جوانی ابھی تک بدستور قائم تھی ورنہ اس عمر میں پہنچ کر جبکہ عورت تین بچوں کی ماں بھی بن چکی ہو جسم تو کجا چہرا تک اپنا تمام اختصاص اور نُدرت کھو دیتا ہے۔ صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ہم ایک ساتھ کھاتے تھے۔ میرے لوٹنے تک وہ میرا انتظار کرتی رہتی۔ ناشتہ کرتے ہوئے وہ زوردار الفاظ میں مجھے اور اور کھانے کو کہتی۔ میرے انکار کے باوجود میری تھالی بھرے جاتی اور ہنس ہنس کر کہتی کہ آپ سے جوان جہان تو کتنا کتنا کھا جاتے ہیں۔ آپ کی خوراک تو کچھ بھی نہیں۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ کسی غیر شخص کے لئے ایسے الفاظ کچھ اس وقت ہی منھ سے نکل سکتے ہیں جب دل کے ہر گوشے میں خوشی ہی خوشی سمائی ہوئی ہو۔ کبھی کبھار جب گھر لوٹنے میں مجھے کچھ دیر ہو جاتی تو وہ بگڑ جاتی اور برافروختہ سے انداز میں شکوہ شروع کر دیتی۔ ناشتہ ٹھنڈا ہونے کے متعلق کہتی اور یہ کہ اگر مجھے دیر ہی سے آنا ہو تو کم از کم میں کہہ تو جایا کروں۔ وہ یوں گھڑی گھڑی گلی میں جھانکنے سے تو بچی رہے۔ کہتی، جب کوئی آہٹ ہوتی ہے میں سمجھتی ہوں آپ آ گئے۔

اس کا کہنا تھا کہ جب سے میں ان کے ہاں آیا تھا گھر میں ہر طرف چہل پہل دکھائی دینے لگی تھی۔ اس سے پیشتر تو وہ سارا سارا دن سو کر ہی کاٹ دیتی تھی لیکن

اب مجھ سے باتیں کرتے کرتے گھنٹے سرک جاتے ہیں اور معلوم ہی نہیں ہوتا ۔ وہ میری ہر بات بڑے انہماک سے سُنتی اور گویا دل ہی دل میں ان باتوں کی قدر کرتی ہو جن عزت بھری نگاہوں سے وہ میری طرف دیکھتی تھی نہ جانے وہ مجھے کیا سمجھنے لگی تھی کیا میں نے کبھی کسی سے محبت کی ہے ؟ اس کے یونہی ہنسی ہنسی میں پوچھے ہوئے اس سوال کے جواب میں اپنی پاکبازی کی ڈینگیں مار کر میں نے اس کے دل میں اور بھی جگہ بنالی تھی ۔ اُسے اس گھر میں آئے تیرہ برس گذر چکے تھے ۔ مگر شاید اُسے اپنے خاوند پر بھی اتنا اعتماد نہ تھا جتنا وہ مجھ پر جتانے لگی تھی ۔ ہم کچھ اس طرح سے آپس میں گھل مل گئے تھے کہ اگر ہماری باتوں میں سے کسی ایک کو بھی بناوٹی تصور کر لیا جاتا تو جس طریق سے ہم رہتے تھے اُسے کوئی نام نہ دیا جاسکتا تھا ۔

لیکن نہ جانے کیوں اس کے خاوند کی موجودگی میں مجھے اس سے بات تک کرنے کی بھی جرأت نہ ہوتی ۔ وہ خود بھی جب وہ گھر میں ہوتا مجھ سے پرے پرے ہی رہتی ۔ یہاں تک کہ شام کے کھانے میں بھی وہ بلا مانگے میری تھالی میں کچھ نہ ڈالتی تھی ۔ اس وقت اس کی تمام تر توجہ خاوند ہی کے لئے مخصوص ہوتی تھی ۔ وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھی ، اس بات کو بخوبی سمجھتے ہوئے بھی ایک دن یونہی ازراہ تمسخر ، چونکہ اب ہمارے درمیان کسی قسم کی شرم ، جھجک کا پردہ نہ رہا تھا ۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے ؟ یکلخت ، جیسے یہ الفاظ کہہ کر میں نے اس کی تضحیک کر دی ہو ، وہ عجیب حیرت و استعجاب سے میری طرف دیکھنے لگی ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت اس نے میری اس بات کا کیا مطلب لیا لیکن پھر فوراً ہی بعد بالکل بے پروائی سے گویا یہ کوئی عام معمولی سی بات ہو اس نے مجھے بتایا کہ اس کا

خاوند بڑا شکی مزاج واقع ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی گویا وہ اس بات کا یقین دلا دینا چاہتی ہو اس نے مجھے اپنی زندگی کا ایک واقعہ بھی کہہ سُنایا کہ کس طرح جب اس کی شادی ہوئے ابھی ایک برس بھی نہ گذرا تھا کہ اس کے خاوند نے اپنی سگی بہن کے لڑکے سے لڑائی مول لے لی تھی۔ کہنے لگی، وہ مجھے اپنی بہنوں سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ ہم لوگ انہی کے یہاں رہتے تھے۔ میں ذرا اس سے ہنس بول لیتی تھی۔ مگر آج تیرہ برس ہونے کو آئے ہیں، اور اب، جبکہ وہ خود بیوی بچوں والا بن چکا ہے اس نے پھر کبھی اپنی صورت ہمیں نہیں دکھائی۔ اتنا کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا لیکن پھر فوراً ہی وہ مسکرا پڑی اور بڑے تشویشناک انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیوں۔ آپ نے کیا سمجھا تھا ــــ؟" لیکن میں نے یونہی ٹال مٹول کر کے بات آئی گئی کر دی۔ نہ جانے وہ کون سا غیر معمولی واقعہ تھا جس کی یاد نے اس کے رگ و پے میں ایک لہر سی دوڑا دی تھی۔ میرا ارادہ اسے کسی قسم کی کوفت پہنچانے کا ہرگز نہ تھا۔ میں نے تو یونہی مذاق کی خاطر یہ بات کہنا چاہی تھی۔ البتہ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی کہ اگر اس کا خاوند واقعی اس قدر شکی مزاج تھا تو اس کے کہنے پر وہ مجھے اپنے یہاں اٹھا لانے پر کیونکر رضامند ہو گیا۔ خود اس کا بھی میرے ساتھ کچھ ایسا ویسا برتاؤ نہ تھا کہ جس سے وہ مجھے شبہہ کی نظر سے دیکھتا ہو، ایسی کوئی جھلک مل سکتی۔ جو بھی تھا۔ اگر اس کی باتوں کے پیشِ نظر میں کوئی بھول کر بیٹھتا تو یقیناً اس کی زندگی اجیرن ہو جاتی۔ میں پہلے سے بھی زیادہ محتاط رہنے لگا۔

ایک دن وہ مجھ سے پوچھنے لگی کہ وہاں آنے سے پیشتر میرا اس کے بارے میں کیا خیال تھا۔ کہنے لگی، میں اکثر آپ کو باہر سے آتے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔ ان دِنوں آپ

گیارہ بجے کیوں لوٹتے تھے جب کہ چھٹی آپ کو دس بجے ہی ہو جاتی ہے۔ مگر میرے اس جواب پہ وہ بہت حیران ہوئی کہ میں تو اُسے بالکل ہی نہ پہچانتا تھا اور میں نے تو اُسے اُن کے یہاں آکر ہی پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس نے سمجھا میں مذاق کر رہا ہوں کیونکہ پچھلے چند دنوں سے اسے مجھ سے شکایت رہنے لگی تھی کہ میں اس کی ہر بات کو مذاق میں اڑا دیتا ہوں۔ کہنے لگی، میں نے تو بیسیوں دفعہ آپ کو ادھر دیکھتے ہوئے دیکھا ہے۔ آپ کیسے کہتے ہیں کہ آپ مجھے پہچانتے نہ تھے۔ لیکن جب میں نے ذرا پُر لطف انداز میں مسکرا کر یہ کہا کہ مجھے کیا خبر تھی کہ کوئی میرے انتظار میں یُوں بیٹھا رہتا ہے۔ ورنہ دس کے بجائے میں نو ہی بجے لوٹ آیا کرتا۔ تو اس نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھ کر کچھ اس طرح بدن چُرایا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا جیسے کہنا چاہتی ہو آپ تو حد میں بھلانگنے لگے یہ کچھ زیادہ اچھا نہیں۔۔۔ لیکن یہ کچھ زیادہ بُرا بھی نہ تھا کیونکہ وہ خود اسے بُرا نہ سمجھتی تھی۔ ایسی ایسی باتیں جو مجھے کسی صورت بھی نہ کرنا چاہیئے تھیں ان پر بھی وہ ظاہری خشونت تک نہ دکھاتی بلکہ وہ تو خود مجھے اس قسم کی باتیں کرنے کی ترغیب دیتی تھی۔ جانتے ہو ایک دن اس نے مجھے ایک ایسے بچے سے تشبیہہ دی کہ جسے ابھی تک اپنا ازاربند بھی نہ باندھنا آتا ہو۔ اس وقت وہ میرے گلے میں پہنے ہوئے سویٹر کی رنگت اور اُس کی بُنتی پہ پھبتی آمیز الفاظ میں نکتہ چینی کرتی ہوئی ایک طرح سے میری بہن کا مذاق اُڑا رہی تھی کہ جس نے وہ سویٹر بُن کر مجھے بالکل چھند بنا دیا تھا۔ کہنے لگی، آپ بھی کس قدر بھولے ہیں۔ ایسی شوخ رنگت کے کپڑے تو لوگ دو دو چار چار برس کے بچوں کو پہناتے ہیں۔ میرے اس کہنے پہ کہ اچھا اب آپ ہی مجھے نوجوان بنا دیجئے۔ اس نے اسی دن اپنی گرہ سے پیسے دیکر اُون منگوائی

اور دو دنوں ہی میں سویٹر تیار کر کے مجھے پہنا دیا۔ نیچے بارڈر کے ایک کونے پر
اس نے اپنا نام بھی کاڑھ دیا تھا۔ "ساوتری" — ساوتری نام اس کے میکے گھر کا
تھا، سسرال کے نام "سہاگ رانی" کو نہ جانے کیوں اس نے ترجیح نہ دی۔ حالانکہ
اس گھر میں اس کا یہی نام چلتا تھا۔ خود مجھے بھی ساوتری کے بجائے سہاگ رانی
زیادہ پسند تھا کیونکہ اسی کی طرح یہ نام بھی رومانی اور ایک حد تک پُر معنی تھا۔
یہ ناموں کا بھی کیا گورکھ دھندا ہے۔ یہی دیکھو ساوتری اور سہاگ رانی میں
کس قدر مماثلت ہے۔ ساوتری صدیوں پہلے کی ایک پتی برتا دیوی کا نام ہے جو
خاوند کے ساتھ ستی ہو گئی تھی۔ اور یہ سہاگ رانی —

اور وہ تھی بھی اپنے سہاگ کی رانی ہی۔ ان کی ازدواجی زندگی کس قدر مسرت زا
اور پُرسکون تھی۔ اس کا خاوند اس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش کو فرض اوّلین سمجھ کر پورا کرتا تھا
اور وہ بھی اس کا کس قدر خیال رکھتی تھی۔ لیکن ایک صبح جب میں دفتر سے واپس لوٹا
تو ان دونوں میں بُری طرح تُو تُو میں میں ہو رہی تھی۔ اگرچہ میرے لئے یہ ایک پہلا
موقع تھا لیکن میں نے دخل دینا نامناسب سمجھا۔ آخر گھر کے دو برتنوں میں کھنک
کھنک تو ہو ہی جاتی ہے۔ پھر میاں بیوی کا رشتہ تو اس لحاظ سے اور بھی کھٹکنے
کھٹکنے کا منت کش ہوتا ہے۔ وہ میرے کمرے کے برابر والے کمرے میں تھے کس
بات پر تکرار ہو رہی تھی یہ تو میں نہ جان سکا۔ البتہ جب اس کا خاوند جھٹ کیوں لغو ل
اور آخر میں گلوگیر آواز میں کچھ کہہ کر باہر چلا گیا۔ اور وہ وہیں پڑی پڑی رونے لگی۔
تو وہ دونوں مجھے تعجب کی حد تک قابلِ رحم دکھائی دیئے۔

مجھے یقین تھا کہ حسبِ معمول جلد ہی وہ میرے کمرے میں چلی آئے گی۔ لیکن

جب بہت دیر گذر جانے پر بھی وہ نہ آئی اور اس کا رونا بھی بند نہ ہوا تو اس خیال سے کہ شاید اسے میرے آنے کا علم ہی نہ ہوا ہو میں خود ہی اس کے کمرے میں چلا گیا۔ اس وقت وہ پلنگ پر تکئے میں منہ چھپائے اوندھی لیٹی تھی سسکیوں کی وجہ سے اس کا تمام بدن زخمی رگ کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ایک والہانہ مرتعش کیفیت، گویا اسے شدید اعصابی دورے پڑ رہے ہوں۔ ان دونوں میں قصور کس کا تھا، میری کھوج ادھوری ہی تھی لیکن اس کی وہ حالت میرے جذبۂ رحم کو بُری طرح جھنجوڑنے لگی۔ مجھے خواہ مخواہ اس کے خاوند پر غصہ آنے لگا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی ناخوش رہے یہ مجھے پسند نہ تھا۔ دراصل کسی معمولی بات پر تو وہ خود بھی رنجیدہ ہونے کی نہ تھی۔ معمولی معمولی باتوں کو خاطر میں لانا تو اس کی عادت میں داخل ہی نہ تھا۔ ڈھارس بندھانے کی غرض سے میں نے اُسے شانے سے پکڑ کر ہلانا چاہا لیکن میں نے ابھی اُسے چھُوا ہی تھا کہ وہ ایک دم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ اور عجب حیران کُن نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی جیسے سوتے سوتے تھک گئی ہو۔ اس کے چہرے پر ادھورے خوابوں کی سی بیچارگی اور بیزاری آشکارا تھی۔ اُسی دم اُس نے آنسو پونچھ ڈالے اور مسکرانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ اس کی وہ مسکراہٹ جیسا کہ میں نے دیکھا اپنی ڈگر سے ہٹی ہوئی تھی کچھ عجیب ہی انداز تھا۔ دونوں ہونٹ بائیں گال کی طرف سُکڑ کر ایک ہلکی سی قوس پیدا کر رہے تھے۔ یُوں دکھائی دیتا تھا گویا وہ سامنے کی ہر شے کا بے کیف تمسخر اُڑا رہی ہو۔ شاید اُسے یقین نہ تھا کہ میں ان کی باتیں سُن چکا ہوں، کیوں کہ جب میں نے وہاں اس کے پاس ہی بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نہایت

حلیمانہ انداز میں پوچھا کہ کیا بات تھی جو اس کا خاوند یوں چراغ پا ہو رہا تھا تو وہ جو ابھی کھُل کر مسکرا بھی نہ پائی تھی ایک دم پھُوٹ پڑی۔ اُس نے اپنا ہاتھ نہیں کھینچا بلکہ مجھے یقین ہے کہ اگر میں اس کے ساتھ سٹ کر بیٹھا ہوتا تو وہ شاید اپنا سر بھی میرے کندھے پر ڈال دیتی۔ انگلیوں کی پوروں تک اس کے تمام بدن میں ارتعاش پیدا ہو گیا تھا اور وہ یوں بغور زمین کی طرف دیکھ رہی تھی گویا ٹپ ٹپ گرتے ہوئے اپنے آنسوؤں کی بوندوں کو گننا چاہتی ہو۔ کس وجہ سے یہ نوبت آئی تھی۔ میں نے جاننے کے لئے بہت زور دیا، حلیمی برتی، وہ نہیں بتاتی۔ ترشرو بھی ہوا۔ ہر گذرنے والے لمحے میں میں اس کے جواب کا منتظر تھا۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ کم از کم ان الفاظ کا تو میں بہرحال متوقع تھا۔ لیکن اس نے میری کسی بھی بات کا جواب نہ دیا۔ کئی ایک مرتبہ اس نے کچھ کہنے کا ارادہ بھی کیا مگر الفاظ اُس کی زبان تک آتے آتے رُک گئے۔

خفگی سی جتا کر میں اپنے کمرے میں واپس چلا آیا۔ لیکن اس کے بعد جتنی دیر بھی میں گھر میں رہا اس کی سسکیاں بدستور سُنائی دیتی رہیں۔ اس دن شام ہونے سے پہلے ہی بغیر کھانا کھائے میں باہر چلا گیا۔ لیکن بعد میں اپنے اس رویہ پر مجھے خود ہی افسوس ہوا۔ وہ مجھ پر کتنا مان کرتی تھی اور میں ــــــ اور دوسرے دن جب میں لوٹا تو بجائے اس کے کہ میں اس کے کمرے میں جا کر کچھ کہتا، کچھ پوچھتا وہ خود ہی میرے کمرے میں چلی آئی اور آ کر نڈھال سی کرسی پر گر پڑی۔ اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر اُترا ہوا تھا۔ شاید وہ رات بھر روتی رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے نچلے پپوٹے بُری طرح سوج گئے تھے اور ان پر کالی کالی لکیریں اُبھر آئی تھیں۔

کل میں کھانا کھا کر کیوں نہیں گیا؟ اس بات کو لے کر وہ اپنے آپ ہی باتوں میں مشغول ہو گئی۔ اس روز پہلی مرتبہ اس نے اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ کہنے لگی "آپ نہ جانے کیا سمجھتے ہوں گے لیکن میری تمام عمر روتے ہی کٹ گئی ہے۔ میرا بچپن، میری جوانی، سب نرک ہی میں گذرے ہیں۔ میری ماں سوتیلی تھی۔ ماں کے پیار تک میں نے زندگی کی کسی مٹھاس کو چکھ کر نہیں دیکھا۔ میرے باپ نے اُسی کے پیچھے چل کر مجھے اس کنوئیں میں دھکیل دیا ــ" اور یہ کہتے کہتے وہ کل کی طرح پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کتنی دیر تک وہ اسی طرح روتی رہی۔ اس کے آنسو اس کے دل کی تمام تر قوتِ برداشت کی نمائندگی کر رہے تھے اس کی وہ حالت گویا اپنے آپ پہ ہی بین کر رہی تھی۔" آپ ہی کہیں سُکھی کون ہے؟" دفعتاً سنبھل کر وہ پھر بولی۔"وہ جو سامنے کی چیز کو دیکھتا ہے یا وہ جو نگاہوں سے اوجھل کو دیکھنا چاہتا ہے؟ میں اپنی زندگی کی کئی تصویریں بنایا کرتی ہوں۔ دراصل میں خود اپنی نظروں میں گری ہوئی ہوں لیکن نہ جانے کیوں شروع ہی سے میرے دل میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ میری زندگی ضرور پلٹا کھائے گی ــ" ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک مختصر ترین لمحے کے لئے اُس کی آنکھوں میں کسی عرشی طائر کی پرواز کا عکس عود کر آیا۔ لیکن پھر دفعتاً رو پڑنے سے اس کی آنکھوں میں وہ سراج گڈمڈ سی ہو کر رہ گئی۔ میں اپنے دل میں عجیب قسم کی اُلجھن محسوس کر رہا تھا جس طرح ایک دم ایک معمہ کے رُوپ میں وہ میرے سامنے آکھڑی ہوئی تھی، اُس نے مجھے ایک عجیب دوراہے پہ لا کھڑا کیا تھا میں حیران تھا کہ اس کی ان باتوں کا کیا مطلب لوں اور کیا نہ لوں۔ وہ جو اس سے

پہلے اپنے خاوند پر جان سی چھڑکتی دکھائی دیتی تھی اب اسی کو اپنے لئے سوہانِ روح قرار دے رہی تھی۔ اس کی یہ باتیں کچھ کم تعجب انگیز نہ تھیں مگر جس طرح اس کی حالت بیزارکن ہوگئی تھی میرا اپنا دل ہار گیا۔ بے اختیار میری آنکھیں بھی نم آلود ہوگئیں۔ آنسو پونچھتے ہوئے وہ بولی ——"میں بھی کس قدر پاگل ہوں۔ خیالوں کی دُنیا کا تو کوئی ٹھور ٹھکانا ہی نہیں ——" کتنی یاسیت اور نااُمیدی تھی ان آنکھوں میں۔ واقعی جب انسان اپنے ذہن کی پوری اُڑان کے ساتھ ہوائی قلعے تعمیر کر کے خود اپنے ہی ہاتھوں اُنھیں مسمار کر دینے پر مجبور ہو جاتا ہے تو دل پر کیا نہیں گذرتی۔ خود اپنا ہی وجود بے سر و پا مضحکہ خیز دکھائی دینے لگتا ہے —— اب تم شاید اسے میری کم فہمی کا ثبوت قرار دو گے۔ تمہارے لئے یہ سب کچھ ایک منظم سازش بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا مجھے اپنے یہاں اُٹھوا لانا، میری نازبرداریاں —— پھر اپنے خاوند کے سامنے مجھ سے کنی کتراتے پھرنا، ہاں کوئی بھی شخص اس حد تک متجاوز وابستگی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ باتوں باتوں میں چاہے وہ کہیں سے کہیں نکل جاتی تھی۔ اس نے مجھے دل لگی سے ہٹ کر کچھ اور سوچنے کا موقع کبھی نہ دیا تھا۔ اور اب جبکہ یہ بات بھی ظاہر ہوگئی تھی کہ خود اُسے بھی اس بات کا شدید رنج تھا کہ اس کا خاوند جیسا کہ اس کو ملنا چاہیئے تھا نہیں ملا۔ میرے خیال میں وہ مجھے ایک غمگسار دوست سے کچھ زیادہ نہ مانتی تھی اور اگر میں اس کی وارفتگیوں سے کچھ غلط صحیح نتیجے اخذ کر کے کچھ کر بیٹھتا تو۔ آخر میں اس کے لئے کر بھی کیا سکتا تھا؟ محسوسات کی حد تک۔ تو ہزاروں قیاس آرائیاں کی جا سکتی ہیں۔ لیکن جب سر پر آ پڑنے کا سوال اُٹھ کھڑا ہو تو آدمی

اپنے آپ ہی کو عجیب سا محسوس کرنے لگتا ہے اور کچھ تعجب نہیں جو اس عالم میں پہنچ کر وہ نیم شعوری احساسات بھی سرے ہی سے فنا ہوجائیں۔ ایک سچے ہمدرد کی طرح نہایت انکسار کے ساتھ میں نے اُسے سمجھانا چاہا کہ چاہے جو بھی ہے اُسے اپنی زندگی سے اس طرح کا مذاق نہ کرنا چاہیئے۔ اس طرح جذبات کی رو میں بہہ کر تو وہ اپنی رہی مسرتوں سے بھی ہاتھ دھوئے گی۔ مگر اس کے لئے اس قسم کی تسلیاں شاید دل بہلاوے سے کچھ زیادہ وقعت نہ رکھتی تھیں۔ وہ اور بھی بُری طرح رونے لگی۔

اس دن کے بعد اس میں غیر معمولی ردِّ عمل پیدا ہوگیا کچھ یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی اس زندگی سے کسی بھی سمجھوتے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ ہر وقت اُداس خاطر رہتی۔ ہر وقت کی سنجیدگی نے اس کے چہرے کو کچھ بعید از فہم جذبات سے ڈھانپ دیا تھا۔ ایک عجیب کیفیت تھی۔ گویا چوٹ کھائے ہوئے غرور نے فریب خوردہ احساسات کی صحیح صورت پیش کر دی ہو۔ ہم دونوں بیٹھے ہیں۔ میں کسی عام سی بات یا ہنسی مذاق ہی کی طرف اس کی توجہ مائیل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ خود مجھے اس وقت یہ احساس نہیں ہوسکتا کہ ان لمحات میں بھی اس کے ذہن کو اپنی گذشتہ یا موجودہ زندگی کے کسی ورق کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کی مہلت مل سکتی ہے کہ یکلخت اس کے تیور بدل جاتے اور جیسے اندھیرے میں ٹھوکر کھاتے کھاتے وہ ایک دم سنبھل گئی ہو۔ کسی بھی نقطہ تک پہنچتے پہنچتے اس کی آواز کانپ کر ٹوٹ جاتی۔ اور اس کے بعد چند ہی لمحوں میں ہمارا باہمی رکھ رکھاؤ ایک طرح سے اس کی سسکیوں میں ڈوب جاتا۔

وہ کسی خاص ارادے سے ایسا کرتی ہو، یہ بات نہ تھی۔ زندگی کی ایک خاص کیفیت کے اس کے ذہن پر بُری طرح مسلط ہو جانے ہی سے اس کا دل پکا ہوا پھوڑا بن گیا تھا۔ بولتے بولتے بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ یونہی، ایک طرح سے یہ اس کی عادت بن چکی تھی۔ اپنے بچّوں سے بھی اس نے بڑی بے اعتنائی سے پیش آنا شروع کر دیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو کر وہ اُنھیں پیٹنے تک سے گُریز نہ کرتی۔ وہ ننھی جانیں جنھوں نے شاید لاڈ پیار کے علاوہ دُنیا میں اور کچھ دیکھا ہی نہ تھا اب اپنی ماں ہی کے اس رویہ سے ان کی تمام چلبلاہٹ اور معصوم ضدیں ڈر اور سہم میں بدل گئی تھیں۔ حتی الامکان وہ خود ہی کوئی شرارت نہ کرتے تھے۔ لیکن اس پر بھی جو اُن کی گت بنتی گویا سارا قصور ہی ان کا تھا وہ رو رو کر ہلکان ہوئے جاتے لیکن وہ اُن کی سدھ تک نہ لیتی۔ یہ سب دیکھ کر مجھے اس پر بے حد غصہ آتا لیکن جب میں اس کی طرف دیکھتا تو وہ مجھے بہت ہی معصوم دکھائی دیتی۔ نادانی کی حد تک معصوم۔ جب دیکھتا کسی کونے میں پڑی ٹسوے ہی بہا رہی ہوتی تھی۔

گھر میں ایک عجیب افسردگی سی پھیل گئی۔ میرے کمرے میں آنا جانا بھی اُس نے ایک طرح سے ترک کر دیا تھا۔ کبھی کبھار اگر آ بھی جاتی تو چند ساعتوں کے لیے، اور بات کئے بغیر واپس چلی جاتی۔ اب میرا ناشتہ اور کھانا تک وہ بچّوں ہی کے ہاتھ میرے کمرے میں بھجوا دیتی۔ میں حیران تھا کہ آخر اب کس حصول کی خاطر وہ اپنی ازدواجی زندگی کا اس بُری طرح سے خون کرنے پر تُلی ہوئی ہے؟

تین بچوں کی ماں ہونے کے علاوہ عمر کے لحاظ سے بھی وہ اس دور میں آپہنچی تھی جب عورت کو کسی نئے راستے میں داخل ہونا زیب نہیں دیتا بلکہ اس عالم میں تو خاوند یا بچوں سے ہٹ کر کسی دوسری طرف مائل ہونے کی گنجائش ہی نہیں رہتی قدرتی طور پر ہر بُری خواہش اچھی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر اگر محض جذبات ہی کے سہارے وہ یوں ڈانواڈول ہوگئی تھی تو اس لحاظ سے اس کا وجود ایک حد تک قابلِ نفرت تھا۔ میں مانتا ہوں کہ زندگی کے پیہم رنج والم کی شدت نے اس کے سوچنے سمجھنے کا ایک ہی محور قائم کر دیا تھا اور ہر شے میں اسے اپنی ہی تذلیل معلوم ہوتی تھی۔ لیکن کم از کم اب وہ وقت نہ رہا تھا جب وہ اپنی زندگی کے بہتے ہوئے دھارے کا رُخ پلٹ سکتی۔

میرے لئے اب گھر میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ بلکہ وہاں آکر تو میں اور بھی پریشان ہو جاتا تھا۔ آٹھوں پہر کی بے معنی سی غمناک اُداسی، اس کا سیدھے مُنہ بات تک نہ کرنا۔ مجھے بڑی گھٹن سی محسوس ہوتی۔ علاوہ ازیں ایک یہ خطرہ بھی میرے ذہن کی سطح پر اُبھر آیا تھا کہ شاید اس کے خاوند کے دل میں ہمارے متعلق کچھ وسوسے پیدا ہو گئے ہیں۔ اگرچہ اس شبہہ کا کوئی ثبوت نظر نہ آتا تھا۔ تاہم دُور اندیشی اسی میں تھی کہ میں خود ہی اس سے دُور دُور رہنے لگوں۔ خدانخواستہ اگر کسی غلط فہمی ہی کی بنا پر حالات کچھ اور صورت اختیار کر لیتے تو یہ امر مسلّمہ تھا کہ تین بچوں کی ماں کے مقابلے میں ایک غیر شادی شدہ نوجوان ہی قصور وار گردانا جاتا۔ بایں ہمہ میں نے اِدھر اُدھر، دفتر وغیرہ ہی میں رہ کر وقت گذارنا شروع کر دیا۔ کپڑے تبدیل کرنے کی غرض سے مجھے آنا پڑتا تھا وہ بھی میں کم سے کم وقت وہاں پر ٹھہرتا۔

یہاں تک کہ کھانا بھی میں نے باہر ہی کھانا شروع کر دیا۔ اس کے خاوند سے تو کئی دن ہو گئے تھے میرا سامنا ہی نہ ہوا تھا۔ خود وہ بھی مجھے اس بارے میں کچھ نہ کہتی۔ میں سوچتا ہوں مجھے اُسے قابلِ رحم کہنا چاہیئے۔ ہر وقت کی بیقراری، بے کلی اور شدّتِ احساس نے جو اس پر نیم بیہوشی سی طاری کر دی تھی۔ اس کی طبعی شگفتگی جو سرے سے مفقود ہو گئی تھی۔ اس پہ اس کا وہ موہوم اعتقاد کہ اس کے دِل کی مراد کبھی نہ برآئے گی۔ اس کے تاریک اور سُونے مستقبل میں روشنی کی کرن کبھی نہیں پھُوٹ سکتی۔ اور حبیب کہ ان باتوں کے جواز تک کے لئے اسے اجازت نہ دی جا سکتی تھی۔ راستے میں پڑی ہوئی کسی چیز کے مل جانے کی طرح اسے جو خاوند ملا تھا اُسے اس نے آزمایا، پرکھا بیشک اس رُو سے کوئی تعریف یا مذّمت روا نہ تھی لیکن دل ایسے چنچل گھوڑے کی لگامیں محض جبر ہی سے تھامے رکھنا بھی تو امرِ محال ہے۔ اتنی عمر اس نے اس پُرحسرت اور الم انگیز ماحول میں ہنس ہنس کر کاٹ دی تھی۔ لیکن اب ـــــ

لیکن ایک روز وہ خود بخود دلپتی دکھائی دی۔ میری طبیعت کچھ ناساز تھی۔ صبح کام سے فارغ ہوتے ہی میں سیدھا گھر چلا آیا۔ وہاں میں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ دیکھتا ہوں کہ وہ میرے کمرے میں میری چارپائی پر سوئی پڑی ہے اور اس نے میرا شب خوابی کا لباس پہن رکھا ہے۔ اگرچہ یہ کوئی اچھی حرکت نہ تھی مگر اس خیال سے کہ وہ اپنے آپے میں آ رہی ہے مجھے ایک گونہ مسرّت ہوئی اس کے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر بندھے ہوئے تھے اور چہرے سے کچھ اس قسم کے جذبات ہویدا تھے گویا وہ نیند میں کسی لاشعوری تسکین سے حظ حاصل کر رہی ہو۔ لیکن دراصل

وہ سو نہیں رہی تھی کیونکہ میرے پاؤں کی چاپ کے ساتھ ہی وہ بڑی سُرعت سے اُٹھ بیٹھی اور عجیب سراسیمگی کی حالت میں میری طرف دیکھ کر وہاں سے چلے جانے کو اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن میں نے اُسے روک لیا۔

موقع کی موزونیت دیکھ کر کہ چونکہ وہ خود ہی اپنی افسردگی کو شگفتگی میں منتقل کرنا چاہتی تھی اور خاص اسی ارادے سے کہ میرے آنے پر ذرا دل لگی ہی ہوگی وہ میرے کپڑے پہن کر میرے کمرے میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر اس وقت میں نے اُسے خاموشی سے جانے دیا تو نہ جانے وہ اپنے دل میں کیا خیال کرے گی۔ میں سچ کہتا ہوں، اگر کسی طرح میں اس کی زندگی سنوار سکتا تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔ یونہی بات چلانے کی خاطر ہنس کر میں نے اپنے کمرے میں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی اشیاء کی طرف اس کی توجہ دلائی اور کہا کہ اب اُسے اتنا بھی تو خیال نہیں آتا کہ ہفتہ دو ہفتہ بعد ہی میرے کمرے کو ٹھیک ٹھاک کر دیا کرے۔ جونہی یہ الفاظ میں نے منہ سے نکالے وہ چونک سی پڑی۔ جیسے اسے ان الفاظ پر یقین نہ آ رہا ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ کسی نامعلوم مسرّت کے زیرِ اثر کھل اُٹھا۔ اس وقت وہ کچھ اس حد تک قانع اور مطمئن دکھائی دی گویا گذشتہ تمام دنوں کی منحوسیت اور افسردگی میرے ان الفاظ کے ساتھ غائب ہو گئی ہو۔ میں کچھ اور کہنے ہی کو تھا کہ شروع دنوں کے سے انداز میں اور ساتھ ہی ساتھ گویا وہ اپنے آپ کو بھی سمجھا رہی ہو۔ وہ کہہ اُٹھی ــــ" واقعی مجھے کیا ہوگیا تھا۔ لیکن یہ آپ کہہ رہے ہیں آپ ــــ؟" اس کے آگے کچھ الفاظ اس نے جان بوجھ کر حلق میں اٹکا لئے۔ جن کی خانہ پُری کے لئے اس کی آنکھوں میں مسرّت کے آنسو

اُمنڈ آئے اور وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑی جیسے کسی ساکن تالاب میں کوئی سنگریزہ گر پڑے اس وقت اس کا سارا وجود کھِل کھِلا کر ہنستا ہوا دکھائی دے رہا تھا لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ اس کے متعلق وہ مجھ سے کیوں گلہ کر رہی ہے؟ اُسے مجھ سے کس قسم کے سلوک کی توقع تھی؟

میرا ذہن اس نتیجے پر پہنچا کہ بیشک چُپ سادھنے میں پہل اُسی نے کی تھی اور اس کی زندگی کو اس کے خیال کے مُطابق بدل سکنا بھی میرے بس کا روگ نہ تھا۔ تاہم ہمارے درمیان جو دوستانہ مراسم تھے ان کی بنا پر دَم دلاسہ دینا میرا فرض تھا۔ اس کی خاوند سے جھڑپ ہو جانے کے دوسرے دن میں نے اس سے متعلق چند ایک باتیں ضرور کہی تھیں لیکن اس ضمن میں وہ قطعی ناکافی تھیں۔ مجھے ندامت ہوئی کہ اگر میں صحیح طریقے سے اُسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتا تو یقیناً وہ حالات کبھی درپیش نہ ہوتے۔ بلکہ اب تو مجھے اپنی اس روز کی باتوں میں تازہ زخموں پر نمک چھڑکنے کے گناہ کا احساس ہوا۔ اگر میں اس وقت ظاہری طور پر بھی اس کو اپنی حمایت کا یقین دلا دیتا تو بلاشُبہ وہ مجھے اپنا رہبر مان لیتی۔ اس طرح بعد میں چاہے میں اسے کسی راستے پر بھی ڈال دیتا اُس پر اُس کا ایمان لے آنا یقینی تھا۔

میں ابھی ان خیالوں میں الجھ ہی رہا تھا کہ وہ اُٹھ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اور میرے کپڑوں کو جو اس نے پہن رکھے تھے اِدھر اُدھر سے سنوارتی ہوئی ایک دلآویز تبسم کے ساتھ بولی — "میں اس لباس میں کیسی دکھائی دیتی ہوں؟" — اور جن راحت افروز نگاہوں سے وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ میں ہنس پڑا' وہ بھی ہنس پڑی۔ جس دلنواز انداز میں اس کے لبوں پر وہ مسکراہٹ تھرک رہی تھی اس کا

دل گوناگوں مسرتوں سے لبریز معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جب میں نے یونہی اسے چھیڑنے کی غرض سے یہ کہنا شروع کیا کہ معلوم ہوتا ہے آج خاوند کے ساتھ اس کا سمجھوتہ ہوگیا ہے تو یک لخت جیسے گہری نیند میں کسی شور وغوغا سے آدمی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے وہ متحیر سی ہوکر رہ گئی اور اس نے کچھ ان نگاہوں سے میری طرف دیکھنا شروع کر دیا گویا میں نے کوئی روایتی قصہ چھیڑ کر اُسے جنوں اور بھوتوں کی بستی میں لا کھڑا کیا ہو۔ ایک دم اس کا چہرہ اُتر گیا اور وہ اسی طرح ایک ٹک میری طرف دیکھتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

میرے دل میں یہ خواہش زور پکڑ رہی تھی کہ آج میں اُسے اس کی زندگی سے متعلق اتنا کچھ کہوں کہ میری ہمدردی اس سے خراجِ تحسین وصول کر لے۔ میں گذشتہ دنوں کے تمام دھونے دھو ڈالنا چاہتا تھا۔ نہایت ہی پیار بھرے لہجے میں میں نے کہنا شروع کیا کہ ان پچھلے دنوں میں جو صورت حال دیکھنے میں آئی ہے میرا دل اس سے بہت دُکھی رہا ہے، وہ بے قصور ہے، اس کی حق تلفی بھی کی گئی ہے مگر وقت اور حالات انسان کو پچھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ جو ہم چاہتے ہیں اگر وہی سب میسر آنے لگے تو زندگی دکھوں کا نام نہ رہے۔ میرے بولنے کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ سنجیدہ ہوتا چلا گیا۔ اور چند ہی لمحوں میں، جو کچھ دیر پہلے غیر فانی سی مسرت کے نقش اس کے چہرے پر چمک رہے تھے بالکل ہی معدوم ہو گئے، ایک بے جان بُت کی طرح ساکن، بے حس، پلکیں جھپکائے بغیر، عقابی نظر دل سے وہ میری طرف دیکھتی رہی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ندامت اور شرمندگی محسوس کر رہی تھی اور ہر لمحہ مجھے اس بات کا یقین ہو رہا تھا کہ ابھی وہ احسانمندانہ

لہجے میں کہنے لگی گی ـــــ "میں بے حد ممنون ہوں، کہ آپ نے مجھے صحیح راستہ سمجھا دیا ـــ"

لیکن میں بہت کچھ کہتا چلا گیا۔ اور اس نے ہوں تک نہ کی۔ مجھے یاد نہیں کہ کس بات پر پہنچ کر میرے لہجے میں خفگی اور حقارت سی پیدا ہو گئی اور میں اُسے یہاں تک کہہ گیا کہ وہ اس قدر گرے ہوئے خیالات کی عورت تھی، یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ اور یہ کہ اگر آئندہ کبھی اس نے اس قسم کی کوئی حرکت کی تو مجھے اس کے خاوند سے بھی کہہ دینا پڑے گا۔ نہ جانے میں اور بھی کیا کچھ کہہ گزرتا کہ ایک معصوم بچے کی طرح جس کا دل مچلنے کے لئے بُری طرح بیقرار ہو رہا ہو، وہ ادبدا کر رو پڑی اور اس سے قبل کہ میں اور کچھ کہہ کر اُسے کسی دوسری طرف متوجہ کر سکتا وہ سسکیاں بھرتی ہوئی میرے کمرے سے نکل گئی۔

اگرچہ میں نے جو کچھ کہا تھا اس میں بھلائی اسی کی تھی۔ مگر میری ان باتوں سے اُسے جو اذیت پہنچی تھی مجھے اپنے آپ پر سخت افسوس ہوا۔ مرہم رکھنے کے بجائے میں نے اس کے زخموں کو از سرِ نو ہرا کر دیا تھا۔ تلافی کی خاطر میں اس کے کمرے کی طرف بڑھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے اس بات کی معافی مانگ لوں۔ آخر مجھے اس کو یوں جھڑکنے کا تو کوئی حق حاصل نہ تھا۔ مگر اس نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ جسے کھٹکھٹانے پر بھی اس نے نہیں کھولا۔

تمام رات میرا دل مغموم رہا۔ بس یہی لگی رہی کہ جس قدر جلد ہو سکے میں اپنی طرف سے اس کا دِل صاف کر دوں اس نے مجھ پر کیا کیا احسان کئے تھے

اور میں نے ——————

—————— اور دوسرے دن جب میں دفتر سے واپس لوٹا تو خلافِ معمول اس کا خاوند بھی گھر پر موجود تھا۔ جو میرے پہنچتے ہی میرے کمرے میں چلا آیا۔ اور آتے ہی نہایت حقارت آمیز کرخت آواز میں کہنے لگا —— "تم اس قدر کمینے اور بداخلاق تھے یہ مجھے معلوم نہ تھا۔" اور قبل اس کے کہ میں ایک لفظ بھی مُنہ سے نکالوں وہ اور بھی غصے سے بولا۔ "تمھارے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ اسی وقت اپنا سامان لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ —— اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے ——"

●

دھنک

آج بھی وہ اٹکتی مٹکتی اور مسکراہٹیں بکھیرتی ہوئی جب بازار میں سے گذرگئی، تو دوکاندار معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھکر آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ قصبے کے ہر شخص کے لئے ایک معمہ سا بنی ہوئی تھی۔ جب کبھی وہ بازار میں نکلتی لوگوں کی نگاہیں کچھ اس طرح اس کی طرف اُٹھ جاتیں جیسے انھوں نے زندگی میں پہلی بار کسی عورت کو دیکھا ہو۔ اور وہ اس وقت تک ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتے رہتے جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔

اس مختصر سے قصبے میں کل دو اڑھائی سو گھر تھے اور لے دے کر یہی ایک بازار۔ اس بازار میں بھی اِنی گنی دوکانیں تھیں جن میں معمولی ضروریات کی چیزوں کے علاوہ کسی دوسری شے کی جھلک تک نہ ملتی تھی۔ ایک سرے سے دوسرے

سر سے تک اُداسی، بے ترتیبی اور بے سروسامانی ہی منھ چڑا رہی تھی۔ ہر شخص کے چہرے سے کچھ اس قسم کا رُوکھا پن ٹپکتا تھا جیسے اُن میں زندگی کی کسی حرکتِ اضطراب اور بے چینی کا شائبہ تک نہ ہو۔ ایک عجیب قسم کی حرص کے زیر اثر جیسے نہ وہ رو سکتے ہوں نہ ہنس سکتے ہوں۔ رونے اور ہنسنے کے مابین اٹکے ہوئے محجوب اور پشیمان وہ اپنی زندگی گذار رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں کے ہر شخص سے کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہو چکا تھا۔ اور اب تلافی کی خاطر وہ وہ اپنی زندگی کو یُوں بے حس اور بوسیدہ بنا لینے پر مجبور تھا۔

دو سبزی فروش تھے جو گھٹیا قسم کے آلو، سُوکھے سڑے کریلے۔ بُس لُسے بینگن۔ پکی ہوئی توریاں اور کچھ اسی قسم کی دوسری چیزیں صبح کی گاہکی میں بیچ کر شام ہونے تک اونگھتے رہتے۔

ایک حلوائی تھا جو دن بھر تیل کے پکوڑے اور جلیبیاں تلتا رہتا۔ تیل کی سڑاند آٹھوں پہر فضا میں تیرتی رہتی۔ اس کے جسم بلکہ روح میں بھی تیل کی بو تحلیل ہو چکی تھی جس سے شاید وہ کبھی آزاد نہ ہو سکتا تھا۔

ایک حجّام تھا جو صبح لوگوں کے بال چھانٹ چکنے کے بعد اپنے ملگجے آئینے میں جھانک جھانک کر موچنے سے چہرے کے فالتو بال اڑاتا رہتا یا اپنی موٹی موٹی مونچھوں کو بل دیتا ہوا جانے کیا سوچ کر اپنے ہمسائے عرائض نویس کی طرف گھورنے لگ جاتا — عرائض نویس آٹھوں پہر گم سُم بیٹھا خلا میں گھورتا رہتا۔ اس کے مریل سے جسم پر ڈھلے ہوئے کپڑے اس کا مذاق اُڑاتے نظر آتے اور ناک کے بانسے پر کا چشمہ تو اکثر لڑھک لڑھک کر غیر موزوں جگہ پر پہنچ

اٹکے رہنے کے خلاف احتجاج کرتا ہوا دکھائی دیتا۔ شاید خلا میں بھی سیکڑوں قسم کے دھبے اس کے سفید براق کپڑوں پر پھبتیاں کستے ہوئے کہہ رہے ہوتے تھے۔ ذرا اپنے پڑوسی کی طرف تو دیکھو۔ آدمی کے لئے اُجلی یا اچھی پوشاک کا ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا کہ مونچھوں کا اور وہ بھی کچھ اتنی کہ اُن کو اچھی طرح سے بل دیئے جاسکیں.....

عرائض نویس کے اِدھر ایک پان فروش تھا جو چپ چاپ یا تو پان کی پیک نگلتا رہتا یا چھالیا کاٹنے میں منہمک۔ کبھی کبھی سوڈے کی رنگ رنگ کی بوتلوں پہ پانی بھی چھڑکتا جس سے دوکان کے سامنے بہت سا پھُس پھُسا کیچڑ جمع ہوگیا تھا۔ بسا اوقات اس کی آنکھیں اس کیچڑ میں بھی دھنس کر رہ جاتیں اور کچھ وقفے کے لئے اس کے ہاتھ رک جاتے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کتھا چونا پان کے پتوں پر چیڑنے لگتا۔ اس سفید اور سُرخ رنگ کے امتزاج میں نہ جانے اسے کیا کچھ نظر آتا کہ وہ پیک نگلنے کے ساتھ ساتھ چسکیاں بھی لینا شروع کر دیتا۔ شاید وہ اپنی دوکان کے آدھے سے زیادہ پان خود ہی کھا جاتا تھا۔

بائیں ہاتھ ایک حکیم کا دواخانہ تھا جس میں مٹیالی سی چادر بچھی رہتی تھی۔ بنا شیشے کی الماریوں میں گرد سے اَٹی طرح طرح کی چھوٹی بڑی شیشیاں اس بات کی گواہی دیتی معلوم ہوتی تھیں کہ مہینوں سے انھیں چھونے تک کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ایک بڑے تکئے کے سہارے حکیم بیٹھا دن بھر بیکار لوگوں سے گپیں ہانکتا رہتا۔

سامنے ایک بزازی اور آٹے دانے کی اکٹھی دکان تھی۔ جس میں ایک طرف کھدر خاشہ، لدھیانہ اور چھینٹ کے کھلے لپٹے تھان ادھر ادھر لٹکتے رہتے اور

دوسری طرف آٹے دانے، گُڑ تیل پر مکھیاں بھنبھناتی رہتیں۔ ایسی ہی دوسری دوکانیں تھیں جن میں بساطی، رنگریز۔ بڑھئی۔ لوہار۔ سُنار وغیرہ شامل تھے۔

قصبے میں عورتیں بہت ہی کم دکھائی دیتیں۔ کبھی کبھار لانبے لانبے گھونگھٹوں میں چہرا چھپائے سمٹی سمٹائی کوئی صورت نظر بھی آتی تو اس کے جوان یا ادھیڑ ہونے کی تمیز کر سکنا ناممکن ہو جاتا۔ جو بھی دُلہن اس قصبے میں بیاہ کر لائی جاتی، وہاں کی روائتوں کے سامنے سر جھکا دیتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خاوندوں نے اپنی بیویوں تک کو اچھی طرح نہیں دیکھا تھا۔ اور جیسے بیویاں بھی خاوندوں کے حقیقی خدوخال سے ناآشنا تھیں۔ ہر کسی کی روح بھوکی تھی۔ اور جسم نڈھال ہوتا چلا جا رہا تھا۔

لیکن اب اس عیسائی اُستانی کے آجانے سے جیسے ہر کسی نے آبِ حیات پی لیا تھا۔ ان کی روح کا ہر ذرہ صدیوں کی نیند سے ایک دم جاگ اُٹھا۔ اور جیسے ان کے دِلوں کے کواڑ کسی غیر معمولی طاقت نے ایک دم چوپٹ کھول دیئے۔ ان کی دُنیا خوبصورت رنگوں سے معمور ہو گئی۔ جب بھی وہ اپنی رنگ برنگی پوشاک میں ملبوس ہو کر ہونٹوں پر مسکراہٹ چپکائے ان کے سامنے سے گذرتی تو ہر کوئی محسوس کرنے لگتا جیسے آسمان پر قوسِ قزح کے ساتوں رنگ نکھر آئے ہوں۔ اب وہ اوپر آسمان کی طرف بھی دیکھنے لگے تھے اور نیچے کی زمین کے وجود کا بھی اُنھیں یقین ہو آیا تھا۔

اس غیر معمولی تبدیلی کی تہ تک تو شاید وہ نہ پہنچ سکے لیکن ہر شخص کسی نامعلوم جذبے کے تحت بشاش نظر آنے لگا۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے بڑھ جانا چاہتا۔ ہر دوکاندار اپنی دکان چمکانے لگا۔

سبزی فروشوں نے اعلیٰ قسم کی ترکاریاں شہر سے منگوانا شروع کیں۔ حلوائی نے زندگی میں پہلی بار تیل کے پکوڑے اور جلیبیوں کے بجائے بناسپتی گھی کے شکرپارے بیسنی قلاقند اور بوندی کے لڈو وغیرہ لذیذ مٹھائیاں تیار کرنا شروع کیں ان پر چاندی کے ورق چپکا کر اور تھالوں میں چن کر وہ قطار در قطار اوپر نیچے ترتیب سے سجاتا اور جب اِترا کر چوکی پر بیٹھتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے اس کی زندگی بھی ان مٹھائیوں کی طرح خوش رنگ اور شیریں ہو گئی ہے۔

حجام کے اوزار صاف ستھرے اور تیز ہو گئے اب وہ لوگوں کے سر اُنڈ مُنڈ کرنے کے بجائے ولائتی کٹ تراشنے لگا۔ ڈاڑھیاں مونڈتے وقت پہلے وہ محض چہرے پر پانی چھڑتا تھا اب صابن گھسنے لگا۔ ملگجے آئینے میں بھی نئی چمک آگئی۔

عرائض نویس اب خلا میں گھورنے کے بجائے آٹھوں پہر حجام سے اس اُستانی کے بارے میں پوچھ تاچھ کرتا رہتا۔ حالانکہ حجام خود اُسے زیادہ واقفیت بہم نہ پہنچا سکتا تھا۔ اب وہ اس کی موٹی موٹی مونچھوں کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھتا ہوا یوں مُسکرا اُٹھتا گویا کہہ رہا ہو ــــ

"یہ سراسر بیہودگی ہے۔ بھلا محض مونچھیں ہی مردانگی کی صحیح علامت کیونکر ہو سکتی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو تم اب ہر تیسرے چوتھے اپنے کپڑے باڈلی پر پھٹکنے نہ جاتے؟"

پان فروش شہر سے دو بڑے بڑے کیلنڈر لے آیا تھا۔ جن میں چینی عورتوں کے کھلے ہوئے چہرے کسی بہت بڑی فتح کے امانت دار معلوم ہوتے تھے عرائض نویس اکثر ان کیلنڈروں کی طرف دیکھ کر کہہ اُٹھتا ــــ "واہ واہ! ہماری

اُستانی، ہوبہو انہی کے سے کپڑے پہنتی ہے ۔" دوکان کے سامنے کا کیچڑ اب غائب ہو چکا تھا۔ اور اس کی جگہ لکڑی کے ایک بنچ نے لے لی تھی ۔ پھر رات تک لوگ اس بنچ پہ بیٹھے اِدھر اُدھر کی گپیں ہانکتے رہتے اکثر استانی کے متعلق ہی کئی قسم کی قیاس آرائیاں کی جاتیں ۔ اب پان بھی خوب بکنے لگے تھے اور بعض اوقات تو پنواڑی کو اپنے لئے لگا کر علیحدہ رکھا ہوا کرارا پان بھی گاہک کے اصرار پر دے دینا پڑتا ۔

حکیم صاحب کے دواخانہ میں بھی کوری چادر بچھ گئی ۔ تکئے پر نیا غلاف چڑھ گیا ۔ ادھر شیشیوں پر کا گرد و غبار بھی جھڑ چکا تھا ۔ اب سر درد اور پیٹ درد کے مریض بھی دوا دارو کی غرض سے آنے لگے ۔ حالانکہ پہلے بڑی بڑی بیماریوں کے روگی بھی ادھر کا رُخ نہ کرتے تھے ۔ جیسے اب وہاں کا ہر شخص نازک مزاج ہو گیا تھا۔ اور پیٹ درد کے لئے گھر میں اجوائن پھانک لینا اسے ایٹی کیٹ سے گری ہوئی بات معلوم ہوتی تھی ۔

بوڑھے بزاز کی دوکان پر اب کھدر خاشے کے ساتھ لٹھے ململ کی جھلک بھی دکھائی دینے لگی اور گڑ شکر کو مکھیوں سے بچانے کی خاطر وہ کہیں سے لوہے کی جالی بھی لے آیا۔ اس کے اپنے آپ میں بھی غیر معمولی تبدیلی آ چکی تھی۔ پھٹی پُرانی گاڑھے کی کُرتی کے بجائے اب وہ پوری باہنوں والا صاف ستھرا کرتا پہننے لگ گیا تھا۔ اور ٹخنوں سے اوپر کی کچھ نے ادھیا دھوتی کا روپ بدل لیا تھا نہ جانے کیوں اب وہ اپنی آنکھوں میں کاجل بھی ڈال آتا اور کیکر یا پھلاکی داتن کرنے کے بجائے ہونٹوں پر مسّی گھس لاتا ۔ حالانکہ اس کی عمر کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ

اپنے بچے کھچے دانت بھی نکلوا دیتا۔

ہر شخص کے چہرے پر کچھ اس طرح کی بشاشت نظر آنے لگی گویا ان کی بیویاں صبح ہنس ہنس کر الوداع کہتے ہوئے شام کو جلد گھر لوٹ آنے پر زور دے چکی ہوں۔ اور اب، شام کی ملاقات کے خیال ہی سے وہ عجب قسم کی مسرت محسوس کر رہے ہوں۔ جیسے اُن کی دلہنوں کی بانہوں میں ہاتھی دانت کا چوڑا ابھی تک موجود ہو اور ماتھے پر چاند کا ٹیکا بھی۔

جہاں کبھی یہ حال تھا کہ پہاڑ ساون "کاٹے نہ کٹتا اب معلوم ہی نہ ہوتا کہ وقت کے پر کہاں سے نکل آئے ہیں۔ دیئے جلتے ہی وہ گھر کی تیاری کرتے اور ساتھ طرح طرح کی چیزیں آم، خربوزے، دہی کے بڑے وغیرہ جو اَب بکثرت ملنے لگے تھے لے جاتے۔ ان کی زندگی کا سنہری دور شروع ہوا۔ کئی منچلے تو شام کو دُور کے کھیتوں میں ٹہلنے کی غرض سے اپنی بیویوں کو بھی ساتھ لیجانے لگے۔ وہاں کھُلی ہوا کھلانے کے بہانے وہ اُن کے گھونگھٹ بھی اُٹھوا دیتے اور اُن کے چلنے کے ڈھنگ کو یوں غور سے دیکھتے گویا وہ اس استانی کے ساتھ اُن کا موازنہ کر رہے ہوں۔

اُن کی دکانوں پر گاہکوں کا تانتا بندھنے لگا۔ جیسے اس سے پہلے تو وہاں کسی کو کسی بھی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ درزی نئے نئے ڈیزائن کے کُرتے شلواریں سینے لگا۔ بساطی نے آنولے کا تیل اور خوشبودار صابن بھی شہر سے منگوانا شروع کر دیا۔ اُستانی بعض اوقات اس کی دوکان پر اپنی ضرورت کی چیزیں لینے آتی تھی۔ پہلے پہل بُو دار تو لئے۔ پوڈر۔ اعلیٰ قسم کا صابن وغیرہ تو

وہ اس کی فرمائش پر ہی شہر سے منگواتا تھا۔ لیکن اب تو دوسرے لوگ بھی ان چیزوں کو استعمال کرنے لگے تھے۔ خریدتے وقت وہ بڑی تمکنت سے کہتے کہ جو صابن سیم صاحب خریدتی ہیں وہی انھیں دیا جائے بھلا ان کی بیویاں کس سیم صاحب سے کم ہیں یا پھر کبھی کبھی وہ پان والے کی دوکان پر بھی چند لمحوں کے لئے رک جاتی۔ اور سوڈے کی بوتلیں گھر بھجوانے کے لئے کہتی۔ اس کے چلے جانے یا پان فروش کے اس کے گھر سے لوٹ آنے پر وہاں چوکڑی جم جاتی اور اسے کہا جاتا کہ تفصیل کے ساتھ اس کی ہر بات انھیں سنائی جائے۔

دوسری کسی دوکان پر وہ شاذ ہی کبھی رکتی تھی لیکن ہر کوئی شاید محض اسی خیال سے اپنی دوکان کو صاف ستھرا رکھنے پر تلا ہوا تھا۔ کہ ضرور کسی نہ کسی دن کوئی نہ کوئی شے خریدنے کی غرض سے وہ اس کے ہاں بھی چلی آئے گی۔

قصبے میں لڑکوں کے لئے تو برسوں سے ایک پرائمری اسکول چلا آتا تھا۔ لیکن اب لڑکیوں کے لئے عیسائیوں نے نیا نیا اسکول کھولنے کا انتظام کیا تھا اور اسی نئے اسکول کی استانی کی حیثیت سے ہی وہ وہاں آئی تھی۔ شروع شروع میں بائیسکوپ کے ذریعے اس کے ساتھی ایک بوڑھے مشنری نے لڑکیوں کی تعلیم کے فوائد سمجھائے۔ اس نے بھی اس سے متعلق بہت کچھ کہا چنانچہ چند لوگوں نے اپنی لڑکیوں کو سکول میں بھرتی کروا دیا۔

ننھی ننھی لڑکیاں جب گھر آ کر استانی کی سکھائی ہوئی ہمیشہ سچ بولنے صاف ستھرا رہنے اور بڑوں کی عزت کرنے کی باتیں اپنی ماؤں کو سناتیں تو ان کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ اس سے پہلے تو انھیں کبھی اپنی اولاد کو صاف ستھرا رکھنے

کا خیال ہی نہ آتا تھا۔ لیکن اب جیسے انھیں اپنے بچوں کے میلے کچیلے کپڑوں سے گھن آنے لگی۔ ہر ماں یہی چاہتی کہ اس کے بچے دوسروں کی نسبت زیادہ جاذبِ نظر اور پیارے دکھائی دیں۔ وہ بڑے فخر سے انھیں نہلا دھلا کر اُجلے کپڑے پہنائیں اور کنگھی چوٹی کر کے سکول روانہ کرتیں۔ گھر پر جب کبھی بچیاں بڑوں کی سی باتیں کرنے لگتیں تو مائیں اس شان سے سر اونچا اُٹھا کر اپنے خاوندوں کی طرف دیکھتیں گویا کہہ رہی ہوں ـــــ یہ سب ہماری ذات ہی کے کرشمے ہیں۔ بھلا آپ لوگوں سے تو دکان میں آسن جما کر گاہکوں کے انتظار کے سوا اور کوئی کیا سیکھ سکتا ہے۔

ـــــ لیکن جب خاوند اس اُستانی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی ہر بات دہرانے میں مسرت محسوس کرتے تو ان عورتوں کے دل میں اُستانی کے بارے میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے شروع ہو جاتے اور وہ اپنے خاوندوں کی طرف شکوک بھری نظروں سے دیکھنے لگ جاتیں۔ حلوائی کی بیوی نے تو ایک دن یہ کہہ کر اپنی لڑکی کا اسکول جانا چھڑوا لیا کہ اسے اپنی بچی کو میم صاحب نہیں بنانا۔ وہ جیسی بھی ہے اچھی ہے۔ کسی بھی عورت کی طرح وہ یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ اس کا خاوند کسی دوسری عورت میں دلچسپی لینے لگے۔ وہ اپنی پہلی بے لطف اور پھیکی زندگی میں پلٹ آنا پسند کر سکتی تھی۔ لیکن یہ بات اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ رفتہ رفتہ دوسری عورتوں نے بھی کسی نہ کسی بہانے اپنی لڑکیوں کو اسکول بھیجنا بند کر دیا۔ اپنے دل میں سُلگتی ہوئی آگ کو وہ اس کے سوا کسی اور طرح ظاہر نہ کر سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسکول میں لڑکیوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی چلی گئی اور ایک دن اسکول بالکل ہی سونا ہو گیا۔

بوڑھے مشنری نے بائیسکوپ کے ذریعے اور ویسے زبانی بھی بہتیرا سر ٹپکا لیکن اب تو جیسے لوگ اس کی اس فلسفیانہ گفتگو کو سمجھ ہی نہ سکتے تھے۔ عرائض نویس کا خیال تھا کہ اس بوڑھے کھوسٹ کے بجائے اگر استانی ایک بار پھر خود اگر یہی باتیں دہرا جائے تو یقیناً ہر چیز کو نظر انداز کر کے سب کے سب اس کی ہاں میں ہاں ملا دیں گے۔ خود اس کی تو کوئی بیٹی نہ تھی لیکن اگر وہ اس کی طرف بھی اس مطلب کے لئے اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ لے تو وہ خود چولی گھگرا پہن کر اس کا شاگرد بن جائے گا۔ حکیم کا کہنا تھا۔ کہ یہ عیسائی بڑے ڈھیٹ قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی لڑکی جائے نہ جائے ایک بار جو اسکول کھل گیا ہے تو اب ہمیشہ کے لئے کھلا رہے گا۔ پان فروش کو اس بات پہ اعتراض تھا۔ وہ اکثر یہی کہتا ـــــ "یہ کیونکر ممکن ہے۔ بھلا پان کے پتے میں چھالیا الائچی کچھ نہ ہو تو محض پتا ہی کوئی کب تک چباتا رہے گا"ــــــ شاید اس سے استانی نے کسی وقت اس قسم کی کوئی بات کہی ہو گی۔ کیونکہ یہی ہوا ــــــ تین مہینے تک تو جیسے تیسے اسکول کے دروازے پر بورڈ لٹکتا رہا۔ لیکن اس کے بعد ایک دن یکایک ایک لاری شہر سے آئی۔ اور اسکول کے بنچوں اور میز کرسیوں کے ساتھ بوڑھے مشنری اور استانی کو بھی لاد کر لے گئی۔

قصبے کے رنگ روز بروز مدھم پڑتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ ہر چیز اپنے گذشتہ محور پہ آگئی۔

تاریکی اور تاریکی

ہندوستانی فوج کے وہ پانچوں سپاہی اُسے آسمان سے اُترے ہوئے فرشتے معلوم ہو رہے تھے۔ اور وہ فوجی ٹرک کہ جس میں ان پانچ فرشتوں اور اس کے اپنے آپ کے علاوہ تین اور لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ ایک ایسا اُڑن کھٹولا دکھائی دے رہا تھا۔ جو انتہائی تیزی اور روا روی کے ساتھ آسمان کی بلندیوں کی طرف اُڑتا چلا جا رہا ہو۔

اپنے اس احساس کے اظہار کی غرض سے اپنے قریب ہی بیٹھی پارو کے جُوں کے توں چلے آ رہے اندوہناک چہرے کی طرف اس نے دیکھا لیکن اس کی زبان اس کے ذہن کا ساتھ نہ دے سکی۔ پارو بدستور خاموش، مجبوطالحواس سی اپنے عقب میں چھوٹتی چلی جا رہی سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے اب بھی تعجب ہو رہا تھا کہ اتنے تھوڑے سے عرصے میں اتنی باتیں کس طرح ظہور میں آئیں؟ کس طرح

ہندوستانی فوج کے سپاہیوں نے آن کی آن میں انھیں ڈھونڈ نکالا۔ اور کس طرح جلال۔ غنی۔ سراج اور محمود کے سہنے مارنے پر اُتر آنے کے باوجود دشمن میں سے بال کی طرح انھیں ان کی زد سے نکال لیا گیا اور شاید اب بھی اُسے یقین نہ آرہا تھا کہ ظلم وجور کے اس ہلاکت خیز سمندر کو وہ عبور کر چکی ہیں۔ اور یہ کہ اب کوئی غیر معمولی حادثہ از خود پیش نہیں آئے گا۔

پارو کی طرف سے نگاہیں ہٹا کر اس نے وِدّیا اور بھاگونتی کے چہروں پر بھی ایک اچٹتی سی نظر ڈالی کہ شاید انھیں میں سے کسی کو اُڑن کھٹولے میں سفر کرنے کا احساس ہو رہا ہو۔ لیکن وہ دونوں بھی پارو ہی کی طرح ساکت تھیں۔ ساکت اور مبہوت اور کسی غیر معمولی خوف کے آثار ان کے چہروں پر ہویدا تھے۔

اُوڑا سے لیکر رائے ونڈ تک کے سفر میں یہ تیسرا موقع تھا کہ اسے پارو وِدّیا اور بھاگونتی کو لیکچر پلانے کا خیال آیا تھا۔ وہ ان کے کان کھول دینا چاہتی تھی۔ انھیں بتا دینا چاہتی تھی کہ قید وبند کی زندگی سے اب وہ آزاد ہیں۔ آزاد ہندوستان کے آزاد باشندے ان کے خیر مقدم کے لئے ان کا راستہ دیکھ رہے ہیں۔ اب کوئی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ لیکن ہر بار ان کے مغموم، افسردہ اور خوفناک چہروں نے اس کے احساسات کا گلا گھونٹ دیا۔ ہزار خواہش کے باوجود اس کی زبان گنگ ہی رہی۔ کس قدر نادان ہیں یہ — نادان اور بیوقوف! لیکن نادان اور بیوقوف کون ہے؟ لیکچر پلانے میں ناکامیابی کے فوراً ہی بعد چونکی بیقراری کے ساتھ اس کا دل اس سے کہنے لگتا۔ کیا وہ خود اپنے ذہن کو ماضی کی گرفت سے آزاد کرانے کا بہانہ نہیں تلاش کر رہی؟ کیا جو کچھ وہ کہنا چاہتی ہے

اس کے دل کے نہاں خانے کی پیداوار ہے۔ اور کیا اس خونیں موت کا تصور اس کے ذہن پر سے دُھل چکا ہے۔ اس خونیں موت کا تصوّر جو پچھلے چھ ماہ سے اس کے دل کو کریدتا چلا آرہا تھا۔ اور جس کے احساس بھر ہی سے روح کانپ اُٹھتی تھی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور پھر جو وہ نظر اٹھاکر دیکھتی تو کریہہ اور بدشکل انسانوں پر سے آسمانی فرشتوں کا خول اُتر چکا ہوتا اور اُڑن کھٹولے کی تیزی اور روانی زمین کی پستیوں میں غرق ہو جانے کا تہیہ کر چکی ہوتی۔ چند ہی لمحے پہلے کے وہ تمام سہانے اور مسرت خیز محسوسات دلگیر اور تلخ ترین حقیقتوں میں تبدیل ہو جاتے۔ اسے کچھ سمجھ نہ آتی کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ یا اُسے کیا سوچنا چاہیئے!

اس بار بھی اپنے اس احساس کا وہی حشر ہوتا دیکھ کر اس کی طبیعت مکدّر ہو گئی۔ وہی پوشیدہ فکر اس کی آنکھوں میں عود کر آئی۔ اور اس کے مجروح دماغ میں پھر سے ایک ایک کر کے حقیقتوں کے کواڑ کھلنے لگے۔ تم کس قدر خود فریبی میں مُبتلا ہو۔ اس کا ذہن چلّانے لگا۔ تمھارا ماضی ــــ ایک عورت کا ماضی بگڑ چکا ہے۔ صرف ماضی ہی نہیں، تمھارا حال، تمھارا مستقبل، تمھارا سبھی کچھ بگڑ چکا ہے تم کس قدر نادان ہو، تم کس قدر بے وقوف ہو ــــــ بیوقوفوں کی طرح پارو کی گود میں اس نے اپنا سر ڈال دیا۔

پارو اس کی چہیتی، اسے سو سو تسلیاں دینے والی پارو نے آج پہلی مرتبہ اس کے اس طرح غمگین اور اُداس ہو جانے کی کوئی پرواہ نہ کی۔ نہ پیار سے اس کے بالوں کو سہلایا، نہ بگی کہہ کر اس کا ماتھا چُوما۔ آزادی ایسی بیش بہا نعمت سے

مالامال ہو کر بھی آج نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ اسے یاد تھا کہ ایک اسی دن کا انتظار کرتے کرتے ان کی آنکھیں پک گئی تھیں اور ہر اُگتے اور غروب ہوتے ہوئے سورج کے ساتھ آزادی کی زندگی میں سانس لینے کی خاطر وہ کئی کئی طرح کی منتیں نانا کرتی تھیں ــــ "وہ بھی کیسی سہانی گھڑی ہوگی" آنے والی اس گھڑی کے خیال ہی سے ان کی روح کے تاروں سے کیسے کیسے مسحور کن نغمے پھوٹ نکلتے تھے وہ کیسے کیسے رنگین خوابوں میں کھو جاتی تھیں۔ لیکن آج ــــ آج پارو کے چہرے پر مسرّت کی کوئی علامت نہ تھی۔ تبسّم اس کے ہونٹوں پر سے نابود ہو چکا تھا۔ اس کی نتھری ہوئی آنکھوں کی چمک گدلی اور تاریک ہو گئی تھی۔ اور ہمیشہ امید کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑنے کی تلقین کرنے والی اس کی زبان پر تالا پڑ گیا تھا اسے تو اسی وقت ہی سانپ سونگھ گیا تھا۔ جب ہندوستانی فوج کے سپاہیوں کی آمد کی بھنک ان کے کانوں میں پڑی تھی۔ اور غنی اور جلال نے اندر کوٹھڑی میں جا کر تلوار سے ان دونوں کو قتل کر دینے کی دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا۔ "کتوں کی موت مرو گی وہاں۔ کوئی تمھیں منہ نہ لگائے گا"۔

"کتّے"، شدید نفرت سے وہ بڑبڑائی اور اس نے پارو کی گود سے اپنا سر کھینچ لیا۔ ایک مرتبہ پھر ہندوستانی فوج کے ان جانباز اور بہادر سپاہیوں کی طرف احسانمندانہ نگاہوں سے دیکھنے کی اُسے تمنا ہوئی۔ لیکن ذہن میں نمودار ہو رہے ایک نئے خیال کے زیرِ اثر اسی طرح گردن نہوڑائے اس بے شرک کی دیوار کے ساتھ اپنی پشت لگا دی۔

اس وقت بھی تو ہندوستانی فوج کے سپاہیوں کا ایک گروہ ان کے ساتھ تھا

بندوقوں اور سنگینوں سے مسلح، بہادری اور جانبازی کے جذبات سے معمور۔ لیکن ان کے ابھرے ہوئے سینوں، ان کے جاہ و جلال نے ان کی رہنمائی میں رینگتے ہوئے ہزاروں افراد پر مشتمل تین میل لمبے قافلے کو کس قدر دھوکا دیا کسی کے گمان میں بھی یہ بات تھی کہ دن دہاڑے اس بے دریغی سے کوئی اُسے قتل کر سکتا ہے۔ اس کی رہی سہی پونجی، تن ڈھانپنے کے چند ایک کپڑے اور دورانِ سفر میں پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے سر پہ اُٹھائے ہوئے دو چار سیر اناج کے ساتھ اُس کی بہو بیٹیاں بھی چھین لی جائیں گی۔ اور اس کے ان جوانمرد رہنماؤں کا ڈھونڈے سے بھی کوئی نشان نہ ملے گا۔

نہ جانے وہ کونسا مقام تھا —— اس منظر کی تلخی کی تاب نہ لا سکنے کے باوجود اس کا ذہن اس سانحہ کی طرف پلٹنے پر تل گیا۔ اور اس نے دیکھا کہ مردوں نے سروں پر سے گٹھڑیاں اور کندھوں پر سے بچے اتار دیئے ہیں اور سستانے کی غرض سے سڑک کے دو رویہ درختوں کی چھاؤں میں اُتر گئے ہیں تھکان، بھوک، پیاس۔ آبا و اجداد کی جائدادوں کی محرومیت اور زندگی کی تشنۂ تکمیل آرزوؤں کے ملال نے ہر کسی کو نڈھال، چکنا چور کر دیا ہے۔ کچھ اس حد تک کہ اب انھیں نہ زندوں میں شمار کیا جا سکتا ہے نہ مُردوں میں —— زندگی اور موت کے درمیان —— لیکن ابھی ماؤں نے اپنی گود کے بچّوں کو دودھ پلانے کی نیت سے اپنی دودھ بھری چھاتیاں ان کے منہ میں ہی دی تھیں اور لاٹھی کے سہارے چلنے والے بوڑھوں نے زمین پر لیٹ کر کمر سیدھی کرنے کا قصد کیا ہی تھا کہ دفعتہً کہیں دُور ڈھول بج اُٹھے۔ اور ڈھولوں کی آواز کے ساتھ ہی

سارے قافلے میں کھلبلی مچ گئی۔ ماؤں نے بھوک سے بلبلاتے ہوئے بچوں کے مُنہ سے چھاتیاں چھڑالیں۔ بوڑھے کمر سیدھی کرنے سے پیشتر ہی بغیر لاٹھی کے سہارے اُٹھ کھڑے ہوئے اور نوجوانوں نے اپنی بہنوں، ماؤں، بیویوں کو اپنی پھڑکتی ہوئی باہوں میں سمیٹ لیا۔ خود اس کے ایک طرف لہنا سنگھ اس کا نوجوان بھائی اپنے چھ فٹے قد سے بھی دو ہاتھ لمبی برسوں سے تیل پیتی آرہی لاٹھی لئے اور اپنے جسم کا تمام خون اپنی آنکھوں میں کھینچے کھڑا تھا اور دوسری طرف اس کا نحیف و نزار بوڑھا باپ اپنی لرزتی ہوئی کمزور مگر اٹوٹ آواز میں واہگرو کے نام کا جاپ کر رہا تھا اور اس کے پیچھے مارے خوف کے "صمٌ بکمٌ" اس کی بوڑھی ماں اور لاثانی حُسن کی مورت اس کی نئی نویلی بھابی دم سادھے کھڑی تھیں۔ ایک عجیب پُر اسرار سماں تھا وحشت اور سراسیمگی سے آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ قوتِ احساس سُن ہو چکی تھی۔ ست سری اکال کی گھٹی گھٹی صدائیں، واہگرو کے نام کی دلسوز منمناہٹ اور قریب سے قریب تر آتے ہوئے۔ یاعلی کے فلک شگاف نعروں کے باوجود ایک خاص قسم کی خاموشی کا تسلط بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اور — اور — حتیٰ کہ وہ موت کی طرح گراں محسوس ہونے لگی۔

ٹرک کی دیوار سے ٹکی ہوئی اُس کی پشت خود بخود ہٹ چکی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ بُری طرح ایک دوسرے کیساتھ اُلجھ رہے تھے اور اس کی آنکھیں حدِ نظر سے پار کی کسی شے کو کچھ اس انداز سے گھور رہی تھیں۔ جیسے ہر لحظ بدلتے ہوئے منظر کو وہ دیکھ تو رہی ہے۔ لیکن اس کا ذہن واقعات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا، کوشش کرنے کے باوجود وہ اُسے سمجھ سکنے کے قابل نہ ہو سکی تھی —— یہ کیوں ہوا — یہ کیوں ہو رہا ہے؟ ہر لمحہ اور ہر گام پر اس کے ذہن کی کچی پکی راہیں ایک اُسی شاہراہ سے جا ملتی تھیں —— اس کے بھائی نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ اس کے بوڑھے باپ کے سینے میں خنجر گھونک دینے سے انھیں کیا ملا۔ اس کی ماں کے برف کے سے سفید بالوں کے واسطوں پر اور اس کے ان لوگوں کے پاؤں میں لوٹنے کے باوجود کسی کا دل کیوں نہ پسیجا؟ اس کی بھابی کے ارمانوں پر ڈاکہ ڈالنے کی جرأت کیوں کی گئی۔ اور خود اس کے ساتھ ——

اس کے ساتھ جو جو سلوک ہوئے تھے اور جیسی جیسی باتوں سے اُسے دو چار ہونا پڑا تھا اُن کی یاد ہی سے اس کا دل لرز اُٹھتا تھا۔ رہ رہ کر اُسے تعجب ہوتا تھا کہ ابھی تک اس کے جسم میں سانس کی روانی کس بوتے پر قائم ہے؟ اس کی آنکھیں کیوں نہیں پتھرا گئیں؟ اس کے کانوں کو پھٹ جانا چاہیئے تھا۔ اسے بھوک کیوں لگتی ہے؟ اس کی قوتِ فکر کیوں سلب نہیں ہو گئی۔ آخر وہ کونسا جذبہ تھا جس کے زیرِ اثر وہ درجنوں بدمست درندوں کا حکم مانتی رہی تھی۔ کس طرح مادر زاد ننگی ہو ہو کر اس نے جسم کا عضو عضو نچوانا برداشت کیا اور ایک وفاشعار بیوی کی طرح ایک ساتھ دس دس خاوندوں کی خدمت گذاری کے فرائض سرانجام دیئے —— کاش کہ لہنا سنگھ اس کا بھائی زندہ ہوتا۔

کوٹ شاہ میں جہاں کے تمام نوجوانوں اور بوڑھوں میں قوم پرستی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور جو اُس کی نسائیت، اس کے جسم کے پرخچے اُڑا دینے ہی کو اہم ترین قومی خدمت قرار دیتے تھے —— امین آباد میں —— جہاں اُس کی

پوشاک اور اس کا نام تبدیل کیے گئے ۔ جہاں شریف کی ماں نے خود اس کی ماں کی طرح پچکار پچکار کر اسے گائے کا گوشت کھلایا ۔ نماز ادا کرنے کے ڈھنگ بتائے ۔ کلمۂ پاک کے ایک ایک لفظ کی تشریح کی اور اپنی دُلہن بنا کر شریف نے اس کے ساتھ شریفوں کا سا برتاؤ کیا ـــــ تیلانی اور ترپوبت میں ـــــ جہاں کے ہر گھر، ہر حویلی میں ایک ایک رات اُسے مہمان رکھا گیا اور میزبانوں نے اس کی خاطر مدارات میں ایک دوسرے سے بازی لیجانے کی ہر ممکن کوشش کی ۔ دسیر پور اور ہیتو کی اور چک نمبر ۲۵ میں جہاں گائے بھینسوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر اس کے بھاؤ باندھے گئے ۔ اور گائے بھینسوں سے کہیں کم قیمت پر اُٹھا لیجانے والے ان میراثیوں، حجاموں، اور چماروں کے علاوہ ان کے لڑکوں پوتوں اور نواسوں تک نے ادا کی ہوئی قیمت کو کئی کئی طرح کھرا کیا اور پھر اور درا میں جہاں چاروں سگے بھائی جلال، غنی، سراج، محمد دے ـــ جہاں اور جس وقت بھی اس کے حواس ذرا دیر کے لئے قائم ہوئے لہنا سنگھ اس کا مرحوم بھائی انتہائی غیض و غضب کی حالت میں اس کے سامنے آ کھڑا ہوا ۔ اس کی سم چڑھی ہوئی لاٹھی ہوا میں لہرانے کے لئے بیقرار دکھائی دیتی ۔ اور اس کی آنکھوں پر خون اُگلتے ہوئے فوارے کا دھوکا ہوتا ـــــ اور اس کی آنکھوں کے سامنے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہ منظر گھوم جاتا جب شنگارا سنگھ نے گاؤں سے قدرے دُور کے کھیتوں میں اسے اکیلی دیکھ کر اور یہ دیکھ کر کہ آج کسی صورت میں بھی اس کا وہ اُسے سُنا سُنا کر ہیر اور رجگا الاپنا رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتا، اس کا راستہ روک لیا تھا ۔ اور گھر آ کر اس نے لہنا سنگھ کے ورزش سے کمائے ہوئے جسم

اور برسوں سے تیل پیتی آرہی اس لاٹھی کو ابھی کچھ زیادہ بُرا بھلا نہیں کہا تھا ـــــ کہ لہنا سنگھ کی اس لاٹھی کے ایک ہی بھرپور ہاتھ نے شنگارا سنگھ کی کھوپڑی کو ہیر اور رجگے کا کیڑا بھیجے کی صورت میں اُگل دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ کاش کہ آج لہنا سنگھ زندہ ہوتا ـــــ

لیکن لہنا سنگھ زندہ نہ تھا۔ اس کی پھڑکتی ہوئی باہوں کے پٹھے مُردہ ہو چکے تھے۔ اور اس کا وہ عزّت دآبرو پر مرمٹنے کا احساس فنا ہو چکا تھا اور اس کی وہ لاٹھی ـــــ کون تھا جو اس کی اس طرح گت کرنے والوں کا سر کچل کر رکھ دیتا۔ جو اسے اس طرح چھپٹا تا دیکھ کر تڑپ اُٹھتا، رو دیتا نہ اسے ذرا سا کانٹا چبھ جانے پر خود بے حال ہو ہو جانے والی ماں کی ماستانہ اپنے حصّے کا ایک آدھ بیر یا برفی کی چھوٹی سوٹی ڈلی خود نہ کھا کر اس کے لئے رکھ چھوڑنے والے باپ کی محبت، شفقتیں! کچھ بھی تو نہ رہ گیا تھا۔ کاش اس کی ماں ہی زندہ ہوتی! اس کا باپ ہی زندہ ہوتا! اس کی بھابی ـــــ لیکن نہیں، بھابی کی زندگی کے بجائے وہ اس کی موت کی زیادہ خواہاں تھی۔ بھابی کے بارے میں اُسے کچھ علم نہ تھا۔ شاید بھابی بھی کسی ـــــ کسی ناقابل برداشت چوٹ کا احساس اُسے بھابی کی زندگی کے متعلق کچھ سوچنے سے ہمیشہ کنی کترانے پر آمادہ کر دیتا تھا۔ لیکن وہ اتنا سمجھ چکی تھی کہ اس آسانی سے وہ اُسے فراموش نہیں کر سکتی ـــــ نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہوگی وہ؟ اپنی پامالی اور بے بسی سے اُچک کر اکثر اس کا ذہن بھابی کی بے بسی اور بیوگی کے جانکاہ تصور میں کھو جاتا۔ اُس کے فسوں ساز حُسن کی کیفیت۔ زندگی کے فقط شیریں خوابوں کی ہی بدولت توانائی حاصل کرنے والا اس کا رومان انگیز دل

— دِل، جس نے لہنا سنگھ کو اکھڑ سے ہنس مکھ بنا دیا تھا، جس نے سارے کُنبے کو گیان گُھمی اور زندگی بخشی تھی اور جب دل نے گاؤں بھر کی زبان پر اپنی مرضی کے مطابق راج کیا تھا اور حُسن — کاش اس کی آنکھیں بھابی کی خاک و خون میں لت پت، سسکتی اور دم توڑتی ہوئی لاش دیکھ چکی ہوتیں۔

"امرتسر میں میرا ایک رشتے کا ماموں ہے۔"

بھاگونتی کے ان الفاظ نے خلا میں گھورتی ہوئی اس کی آنکھوں کو ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ٹرک کی دیوار سے ہٹی ہوئی اس کی پُشت دوبارہ اپنی جگہ پر جا لگی اور ایک دوسری سے اُلجھ رہی اس کے ہاتھوں کی اُنگلیاں کھل کر اس کے ٹخنوں پر بیٹھ گئیں۔

"یا پھر لدھیانہ میں اپنی ماسی کے پاس چلی جاؤں گی۔"

"اور تم — تم کہاں جاؤ گی پارو —؟" بھاگونتی اور وِدیا کو آپس میں باتیں کرتے دیکھ کر اس کے دل میں بھی پارو سے مخاطب ہونے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو، اس کا اپنا دل ہزار گُنا بیقراری کے ساتھ خود اس سے پوچھنے لگا۔

اور تم — تم کہاں جاؤ گی — تمھارا بھائی، تمھاری ماں، تمھارا باپ، تمھارا ایسا کون خیر خواہ ہے جو — اور دفعتہً غنی اور جلال کے وہ ہیبت ناک الفاظ اس کے کانوں سے آ ٹکرائے۔ "کتوں کی موت مرو گی وہاں — کوئی تمھیں منھ نہ لگائے گا۔"

"کُتّے" غیر اختیاری طور پر اس بار بھی اُس کی زبان نے وہی الفاظ دہرا دیئے

لیکن اسکی نفرت اور ملامت کی بجائے لہجے نے غم کو زیادہ اپنایا تھا — "سچ ہی تو ہے ؛ مستقبل کا بھیانک دیو مُنھ پھاڑے اس کے سامنے آکھڑا ہوا" ہندوستان ' ہندوستان کے رحمدل اور خدا ترس انسان تمھارا ماضی سنوارنے کی جُرأت نہیں رکھتے تمھارا ماضی بگڑ چکا ہے ۔ ایک عورت کا ماضی !"

گھبرا کر اُس نے ہر طرف ایک بے اعتباری کی نظر ڈالی ۔

ٹرک اسی طرح ہر طرارے میں میلوں لمبی سیاہ اور پتھریلی سڑک نگلتا اور اُگلتا چلا جا رہا تھا ۔ بھاگونتی اور ودّیا آپس میں سر جوڑے کھُسر پُسر کر رہی تھیں ۔ پارو کے اوسان بدستور خطا تھے ۔ اور ہندوستانی فوج کے وہ پانچوں سپاہی اُسی شانِ بے نیازی سے اپنی بندوقیں اور سنگینیں تھامے اجنبی مقامات ، اجنبی آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے —— اُسے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا ۔ جیسے اس کے خلاف ایک غیر معمولی سازش رچی جا رہی ہے ۔ اُسے بدنام و برباد کرنے کے لئے ۔ اس کے منھ پر تھوکنے کے لئے —— اور اس سازش میں ہوا سے باتیں کرتا ہوا ٹرک اور ہندوستانی فوج کے سپاہی نہایت مستعدی کے ساتھ اپنا اپنا فرض ادا کر رہے ہیں ۔ اس سازش میں بھاگونتی اور ودّیا بھی برابر کی شریک ہیں ۔ پارو نے بھی اُسے ہر ممکن آزار پہنچانے ، اُسے تہس نہس کرنے کے لیے اپنی شرکت کا اعلان کر دیا ہے ۔

"پارو" شدتِ غم سے نڈھال ہو کر اس نے پارو کو جھنجوڑ ڈالا ۔ لیکن کسی طعنے کے بجائے اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے ۔ اور جونہی پارو نے اُسے اپنی بغل میں لیکر اس کا سر اپنے گھٹنے پر رکھا ۔ ایک معصوم بچّے کی طرح وہ پھوٹ پڑی ۔ اور جیسے

اپنے دل کی تمام کدورت وہ اپنے آنسوؤں سے دھوڈالنا چاہتی ہو، پارو کے خاموش دلاسوں، بھاگونتی اور ودیا کے پچکارنے ——— "ہماری طرف نہیں دیکھتیں" اپنے بیٹے چلے نصیبوں کا حوالہ دیکر اپنی آنکھیں بھی نمناک کر لینے کے باوجود اس کی حالت نہ سنبھلی۔ مجبوراً ہندوستانی فوج کے سپاہیوں کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

"صرف دو گھنٹے کا سفر اور ہے بی بی"

"وہ سامنے لاہور ہے اور لاہور کے بعد"

"ڈرائیور سے کہو رفتار اور تیز کر دے"

"اچھا اچھا"

"میں کہتا ہوں ہماری یہ آزادی......"

وہ اور بھی بہت کچھ کہتے رہے۔ ٹرک کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ پارو نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں۔ بھاگونتی اور ودیا کے لہجے میں اور بھی دلجوئی آگئی۔ لیکن اس کے آنسوؤں نے تھمنے کا نام نہ لیا اور نہ جانے یہ فزوں تر ہوتا ہوا تسلسل کہاں جا کر ختم ہوتا کہ ایک دھچکے کے ساتھ ٹرک رک گیا۔ اور پانچوں سپاہی نیچے کود گئے۔

پارو کی انگلیاں وہیں کی وہیں ٹھٹک گئیں۔ بھاگونتی اور ودیا کی دلجوئیوں اور تسلیوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ نہ معلوم کیا ہونے والا ہے ——— کسی جانسوز حادثے کے تصور سے ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انھوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا اور گویا ایک دوسری میں سما جانا چاہتی ہوں، وہ ایک دوسری سے لپٹ گئیں۔ خود اس کے آنسو بھی وہیں کے وہیں جم گئے اور پارو کے گھٹنے پر سے

سر اُٹھا کر ہراس بھری نگاہوں سے وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی ـــــ لیکن جلد ہی اُسے یہ معلوم ہو گیا کہ وہاں خطرے کا کوئی امکان نہ تھا۔ ٹرک کی اگلی طرف ان پانچ ہندوستانی سپاہیوں میں سے تین چھاتیاں تانے بندوقیں کندھے پر رکھے بڑی لاپروائی کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ اور باقی کے دو سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک سُرخ رنگ کی عالیشان عمارت کے سامنے کھڑے کسی فوجی افسر کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ اور اس فوجی افسر کا چہرہ بھی ـــــ "کچھ نہیں ہوا، کچھ نہیں ہوگا" کی سی لاپروائی کا مظہر تھا۔ اس منظر سے جہاں اس کے حواس مختل ہوتے ہوتے بچے۔ وہاں اپنے خیال کے برعکس پُرامن فضا دیکھ کر اُس کے ذہن نے ایک نیا رُخ اختیار کر لیا اور ارد گرد کے ماحول سے بالکل بے خبر ہو کر وہ ایک نئی سوچ میں گم ہو گئی۔ اگر سچ مچ ہی کوئی حادثہ ہو جاتا۔ آخر سینکڑوں ہتھیار بند حملہ آوروں کے مقابلے میں ہندوستانی فوج کے ان سپاہیوں کی بساط ہی کیا ہے؟ سنسناتی ہوئی ایک گولی اسکی کنپٹیوں کو چھیدتی ہوئی نکل جاتی۔ کسی برچھے کا پھل اس کے سینے میں اُتر جاتا یا پھر ـــــ ہاں وہ اس کے لئے بھی تیار رہتی۔ شریف کا سا کوئی شخص اُسے اٹھا لے جاتا۔ شریف کی ماں سی کسی کی ماں اس کی مینڈھیاں گوندھتی ہوئی اُسے کلمہ ازبر کرایا کرتی ـــــ وہ سبھی کچھ نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کر سکتی تھی۔ شریف کے چاؤ چونچلے مسلمانی نام، مسلمانی پوشاک، نماز، گائے کا گوشت ـــــ لیکن ہندوستان میں ـــــ یہ پارو بھی کس قدر ناسمجھ ہے ـــــ ناسمجھ اور ناعاقبت اندیش۔ آخر اس کے دل میں ہندوستان کے لئے کونسی کشش ہے۔ ایک یتیم اور لاوارث لڑکی کے لئے ـــــ ایک ایسی بدبخت کنواری کے لئے جس کے سر کی سفید چنری لاتعداد سیاہ

دھبوں کا مرکز بن چکی ہے اور جس کے پیٹ میں چار ماہ کا........ اور یہ بھاگونتی اور ودّیا ـــــ اور اس کے دِل میں ایک طوفان بپا ہوگیا۔ وہ کسی قیمت پر بھی ہندوستان جانا نہیں چاہتی۔ بھلے ہی اس کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ ــ اور وہ وہاں سے چپ چاپ کھِسک بھاگنے کا راستہ تلاش کرنے لگی۔ ٹرک میں سے ایک دفعہ اُتر جانے کے بعد کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی وہ ـــــ

پچھلی جانب سے ٹرک پر سوار ہوتی ہوئی دو لڑکیوں نے اس کے خیالات کو درہم برہم کر دیا۔ عجیب حیرت سے اس نے خاموشی اور خوف کی ان دو مورتوں کی طرف دیکھا۔ اور وہ یہ دیکھ کر اور بھی حیران رہ گئی۔ کہ ٹرک میں بیٹھتے ہی ان کے سراسیمہ چہروں پر خوشیاں اُمڈ آئی ہیں۔ ان کے بھینچے ہوئے ہونٹ وا ہوگئے ہیں۔ اور اُن کی آنکھوں نے غیر معمولی طور سے چمکنا شروع کر دیا ہے۔

ٹرک دوبارہ روانہ ہوگیا۔ ہندوستانی فوج کے سپاہی ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کوئی مبہم سا گیت گنگنانے لگے۔ بھاگونتی اور ودّیا ان دونوں نووارد اور نوعُمر لڑکیوں کی داستان سُننے کے لئے اُن کے قریب سرک گئیں اور جانے کس خیال سے پاردسنے اپنا سر اس کے کندھے پر گرا دیا۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ وہ کسی طرف بھی متوجّہ نہ ہوئی۔

ان دونوں تیرہ تیرہ برس کی لڑکیوں کے چہروں کی فوری تبدیلی نے اس کی فرار ہو جانے کی آرزو کو ڈانواڈول کر دیا ـــــ اس قدر ذلیل اور بے آبرو ہو کر بھی ان کے ہونٹ کیوں مسکرانا نہیں بھولے؟ یہ مزے لے لے کر ہر تفصیل کیسا تھ اپنے آلام کی داستان گوئی، یہ مستقبل کے متعلق سنہری اور خوش آئند قیافے اور

یہ رہ رہ کر احسان‌مندانہ نگاہوں سے ہندوستانی سپاہیوں کی طرف دیکھنا ـــ آخر یہ سب کیا ہے ـــ آخر یہ کون سی خوشی کا مقام ہے ـــ اور وہ تو اپنے آپ کو بھی جی بھر کر کوسنا چاہتی تھی کہ کیوں اروراہیں ہندوستانی فوج کی آمد کی خبر سُن کر وہ آپے میں نہ رہی تھی۔ اور کیوں اس نے ارورا سے لیکر رائے ونڈ ٹیشن تک کے سفر میں مستقبل کی زندگی کے خوشگوار اندازے لگائے تھے۔ کیوں ہندوستانی فوج کے سپاہیوں کو آسمان سے اُترے ہوئے فرشتے تصور کیا۔ اور کیوں ٹرک میں سفر کرنے پر اترائی رہی۔ ـــ لیکن بالکل اسی غیر اختیاری کے ساتھ کہ جس طرح وہ اِن دردناک اور دلآزارانہ خیالات کے تسلسل کو لامتناہی کرنے پر تل گئی تھی۔ اور اسے سوائے فرار ہونے کے کوئی دوسرا روشن پہلو سجھائی نہ دیا تھا، اس کے ذہن نے پلٹا کھالیا۔

"وحشی ظالم" ـــ ان دونوں لڑکیوں کو جنہوں نے ابھی اپنے بچپن کی منزل کو بھی اچھی طرح عبور نہ کیا تھا۔ اس طرح اور اس حالت میں دیکھ کر وہ سُلگ اُٹھی ـــ نہ جانے کتنے خونخوار درندوں نے شبنم کی طرح پاکیزہ ان کی عصمت سے اپنے خونیں ہاتھ رنگے ہوں گے، کس طرح سہے ہوں گے اِن گڑیوں اور ریت کے گھروندوں کے کھیل کھیلنے والی معصوم جانوں نے وہ ناقابلِ برداشت ستم؟ اس کی روح تلملا اُٹھی۔ اِس کا دِل نفرت سے بھڑک اُٹھا اور اُسے خواہش ہوئی کہ وہ ہندوستانی فوج کے ان سپاہیوں کی مردانگی کو للکارے۔ اُنھیں کہے ـــ تم کس طرح اپنی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی بے حرمتی برداشت کر رہے ہو؟ کیا تمھارے بازوؤں میں قوت نہیں؟ کیا تمھاری بندوقیں اور سنگینیں محض دکھاوے بھر کو ہیں؟ کیا اس آزادی کی خوشی میں تم گیت گا رہے ہو ـــ جو ہزاروں بے گناہوں کے خون اور ہزاروں ماؤں بہنوں کی عصمت کے عوض تمھیں حاصل

ہوئی ہے اور کیا ہزار دل اچھوتی اور تشنۂ تکمیل آرزوئیں.........

لیکن ایک جھٹکے کے ساتھ رُکتے ہوئے ٹرک اور ہندوستان ہندوستان کہہ کر ٹرک سے کودتے ہوئے ان پانچوں ہندوستانی فوج کے سپاہیوں نے اس کے بتدریج بڑھتے ہوئے جوش کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ ہندوستان! ہندوستان کی سرزمین! پارو، بھاگونتی ودیا اور ان دونوں معصوم لڑکیوں کے سنہری اور خوش آئند خوابوں کی سرزمین اور اس سرزمین کی پرسحر کشش نے پارو، بھاگونتی، ودیا اور ان دونوں معصوم لڑکیوں کے ساتھ اسے بھی اُٹھنے پر مجبور کر دیا۔

ہندوستان کی سرزمین پر سب سے پہلی چیز جو اسے دکھائی دی۔ وہ لڑکیوں سے بھرا ہوا ایک فوجی ٹرک تھا۔ جو پاکستان کی طرف رخ کئے کھڑا تھا۔

محوّر

کل عدالت میں میری جرح ہے۔ لیکن ان چرخوں سے خدا کی پناہ ! چرخوں کی یہ چرچر، چیں چوں دم مارنے دے جب تو۔ امّی جان پر نہ جانے دوسرے چوتھے یہ کیا بھوت سوار ہو جاتا ہے کہ محلہ بھر کی ان بیاہی مٹیاروں، سہاگنوں اور بوڑھی کھوسٹوں کو اکٹھا کر کے رات بھر سارا گھر سر پہ اُٹھائے رکھتی ہیں۔ ایسے میں کوئی کیا خاک سوچے۔ میں کہتا ہوں......

"اسیں سیلانی فقیر کوئی دم یاد کر دگے" کمرے میں بیٹھی ہوئی سب عورتوں نے ایک ساتھ راگنی چھیڑ دی۔ اس پر چرخوں کی چرچر چیں چوں نے موسیقی کی شکل اختیار کر لی اور ہتھی کی گھنیٹوں اور نازک کلائیوں میں پہنی ہوئی بلوریں چوڑیوں نے انوکھے انوکھے ساز بجائے۔

"اسیں سیلانی فقیر کوئی دم یاد کر دگے"۔

"بڑی اماں کوئی کہانی کہو" یکایک اس اَن بیاہی آواز پر سب چرخوں کی گھومتی ہوئی ہتھیاں ایک چھناکے کے ساتھ رُکیں۔ اور فضا میں اُڑتی ہوئی موسیقی اسی دم ان ہتھیوں میں آکر جذب ہوگئی۔

"میں کہتی ہوں بہن۔ غضب پڑے اس نگوڑے کلجگ پر۔ اب توکوئی شئے ہاتھ لگانے نہیں دیتی۔ میرے بیاہ میں آٹا روپے کا بائیس سیر تھا۔ گڑ سولہ سترہ سیر اور خالص گھر کا گھی ڈیڑھ سوا سیر پکے بٹے جہاں سے جی مانے اُٹھالو۔ لوگ ہنس کر دیتے تھے"

نہ جانے کون بول رہی تھی کہ دوسری کہہ اُٹھی "کچھ نہ پوچھو بہن۔ تمہارے سامنے ہی کی تو بات ہے۔ احمد کی شادی پر کپڑا ہی کپڑا دو ہزار کا پھٹا، کل اِتی پوٹلی بنی۔ لڑکے کی بوا کے تو ناک ہی نہیں چڑھا........"

"گڈی ادھ سمان چڑھا کے ڈوراں کتیاں ماہی وے" پھر ایک نگمّہ سے گیت کے بول بلند ہوئے اور دوسرے ہی لمحے بہت سی آوازیں اس میں شامل ہوگئیں۔ "گڈی ادھ سمان چڑھا کے ڈوراں کتیاں ماہی وے"

درمیان کا دروازہ بند ہونے پر بھی میں بخوبی یہ اندازہ لگا سکتا ہوں کہ کمرے میں کتنے بڑھاپے اور کتنی جوانیاں موجود ہیں۔۔ اس چلکتی اور بھونڈی آواز کے امتزاج میں ــــ ہوں! بحث کے دوران میں کہنا ہوگا کہ مدعی امیر علی شاہ ولد رام غلام شاہ نے روپیہ ادھار دیتے وقت مدعا علیہ دمڑی داس، ولد ٹکا مل ساکن اُچے پنڈ کے دستخط کیوں نہیں لئے۔ کم ازکم انگوٹھا ہی لگوا لیا ہوتا۔ مائی لارڈ اس سے صاف ظاہر ہے کہ......

"رسیا ننبولیا دے وے میری اٹھی کلیجے پیڑ"

یا خدا! میں نے اُٹھ کر دروازے کی درزوں میں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ لال پیلے، سبز، سفید، رنگ برنگے سالو اور چنریاں۔

"کیوں ری بہن اگلے سال انہی دنوں رضیہ کی گود میں ...." اور قریب ہی بیٹھی ایک لال رنگ کے دوپٹے والی نے آنکھیں جھکا کر اپنے گالوں پہ لالی چھپٹ لی۔

"میں نے سُنا ہے" مہندی رنگے بالوں والی ایک بڑھیا بولی۔ "شمیم کا ہونے والا دولھا کچھ پکے رنگ کا ہے سو تو ہوا وہ اور بھی کچھ۔ کل حسین بی بی ہی تو کہہ رہی تھی۔ کیوں گلابو کی چچی!" اور میری نظر دائیں کونے میں بیٹھی ہوئی، دو موٹی موٹی آنکھوں اور ہنستے ہوئے ہونٹوں والی ایک الھڑ جوانی پر جا ٹکی۔ جو اس بات کے ردِ عمل کے طور پر ماتھے پر سلوٹیں اور آنکھوں میں نمی لے آئی تھی کس قدر بھرپور جوانی تھی اس کی۔ جیسے انگ انگ سے نکل بہنا چاہتی ہو اور وہ مسکراہٹ ..... لیکن نہیں، مجھے اس سے غرض! یہ مجھے کام نہ کرنے دیں گی۔

چرچر چیں چوں کی آوازیں جاری ہیں۔ مونگ پھلی بھنی ہوئی تکی، گڑ اور گنڈیریاں سب اپنی اپنی جھولیوں میں سے نکال کر کھانے لگیں۔ سوں۔ سوں۔ پھک اور کونے میں بیٹھی ہوئی شمیم کے چرخے کی مال ڈھیلی ہوگئی۔ باقی چرخے چل رہے ہیں بدستور چرچر، چیں چوں، گھنگھروؤں اور چوڑیوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ میں آکر اپنی چارپائی پر تن گیا ہوں۔ اور ادھر ایک نئے نغمے کی لے پھوٹنے جا رہی ہے۔

آگراں دے ادھلے، سناواں تینوں گل جانی

اک چیچی والا چھلہ وے دے جا نشانی!

× × × × × ×

مڑ نہ آئیوں میرے ماہی، رو رو بیتے جوانی

ہائے چیچی والا چھلہ ....

"کل کوثر کے ابا شہر جانے کو کہتے تھے۔ جائیں گے تو کہوں گی ایک دو شلوار وں کے لئے لٹھا ....."

"اے بانو۔ تم تو نئون اور کریپ کے دوپٹوں کے سوا بات نہ کرتی تھیں۔ یہ کیا مچھر دانی کیا اوڑھ رکھی ہے تم نے!"

"کچھ اپنی بھی تو کہو۔ تمھاری وہ چھبیس کی ململ کے اوپر کرکراتے باریک لہریئے کہاں گئے؟"

"اب تو یہ دیکھتی جائیو کہ جالی لگے ان دوپٹوں کے بجائے کھیس کب اوڑھنے پڑتے ہیں"

"اور پھر کب دریاں ......"

ایک مرا مرا سا قہقہہ اُڑا۔

"واہ واہ چرخے نے چیں چیں لائی" پھر اس بند اور تنگ کوٹھڑی میں موسیقی کی لہریں ناچنے لگتی ہیں اور میں سوچتا ہوں۔ مجھے نیند ہی آجائے۔ ہو گا! صبح اُٹھ کر ہی تیاری کروں گا۔ اور کچھ یونہی میرا دماغ بھٹکنے لگتا ہے۔ یہ چرخے، ان کا یہ بے منزل گھماؤ، مجبور گردشیں۔ ہم سب بھی تو ایک قسم کے چرخے ہی ہیں۔ مجبور، لاچار، بے بس اور یہ کبھی ختم نہ ہونے والا چکر۔ یہ بے منزل گھماؤ ۔ مجبور گردشیں۔

واہ واہ چرخے نے چیں چیں لائی

پھلا کیتا کڈھنڈایا۔ مڑ کتن نوں ہتھ نہ لایا۔۔۔۔۔"

نیں میں مول نہ کیتا۔

"بڑی اماں کوئی کہانی کہو۔"

"چپ ری مرن جوگ۔ ہاں بہن۔"

"پھلا کیتا کڈھنڈایا" لیکن اس بار موسیقی کا رنگ نہیں جم سکا۔ درمیان ہی میں کھسر پسر ہونے لگی۔ اسی اثنا میں تیز سے تیز تر ہوتی ہوئی ایک مسلسل کھانسی نے بھونڈی سی آواز کی صورت اختیار کرلی۔ "کھاؤں کھاؤں۔ ہمارے گاؤں مڑلیچاں میں ایک بار بازی گر اترے۔ کھاؤں کھاؤں۔ ہائے اللہ۔ اب یہ چخ چخ تو بند کرو۔ ان میں سے ایک بازی گر کی ایک چھوکری رجو بڑی دل لگنے والی تھی۔ چندے آفتاب۔ کھاؤں کھاؤں۔ چندے مہتاب۔ کھاؤں کھاؤں۔ کیا کہوں ساٹھ برس کی ہونے کو آئی ہوں میں نے اس ایسی لڑکی پھر نہیں دیکھی۔ کوئی جوان سی جوان تھی۔ کرنا خدا کا یوں ہوا کہ ایک دن انہی بازیگروں کا تماشہ دیکھتے ہوئے ہمارے نمبردار کا بیٹا سلیم بیگ اس پر ریجھ گیا۔ ان دنوں تو خاصا۔۔۔۔۔۔ یہ تھا (نہ جانے بڑھیا نے کس اشارے سے کام لیا) اب تو ڈھل گیا ہوگا بے چارہ۔ ان دونوں کو۔ کھاؤں" کھانسی کچھ زیادہ شدت پکڑنے لگی تھی کہ ایک لمبی کھی۔ ی۔ ی کے بعد وہ دوبارہ کہنے لگی۔ "دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ جینے لگے۔ ساری ساری رات وہ ریتلے ٹیلوں پر یا آم جامن کے باغوں میں گھومتے پھرتے گزار دیتے۔ گاؤں کے لوگوں کو ان کی یہ چاہت ایک آنکھ نہ بھاتی۔ لیکن نمبردار سے کہنے کی ہمت بھی کسی

میں نہ تھی" ــــــــــــ معلوم ہوتا تھا کھانسی کا دورہ اب نہیں اٹھے گا۔

"کسی طرح کچھ دنوں کے بعد نمبردار کو بھی اس بات کا پتہ چل گیا اور اس نے ان بازی گروں کو بہت ڈانٹا پھٹکارا۔ رجو کے باپ کی تو مشکیں تک کسوا دیں۔ اور وہ رات ہی رات اپنا ڈیرہ اٹھا نہ جانے کہاں چلے گئے۔ تب سے سلیم بیگ نے شادی نہیں کرائی"۔ یکایک کھانسی پھر نہ دروں پہ آگئی۔ اور اب کی سلسلہ کچھ ٹوٹا ٹوٹا سا معلوم ہوا۔

"رجو کو پیٹ رہ گیا تھا"۔ بہ مشکل یہ فقرہ پورا کرنے کے بعد وہ کھل کر کھانسنے میں مشغول ہوگئی۔

"اسیں سیلانی فقیر کوئی دم یاد کر دگے"۔ پھر وہی گیت۔ وہی۔ ان بیاہی آواز اور پھر کن سری تانیں۔

چرخے چل رہے ہیں۔ چرچر۔ چیں چوں۔ گھنٹیوں اور چوڑیوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ یہ چرخے یونہی چلتے رہیں گے ــــ رات بھر۔ کون جانے شمیم کے چرخے کی مال ٹھیک بھی ہوگی یا نہیں۔ لیکن کسی ایک چرخے کے رک جانے سے سارا ترنجن تو بند ہونے سے رہا۔ یہ ترنجن ــــ یہ چرخہ کاتنے والیوں کی محفل جہاں گیتوں کے سوتے پھوٹتے ہیں ــــ ہم تو سیلانی فقیر ہیں۔ کسی دن ہمیں یاد کرو گے...... یاسیت کے ساتھ ساتھ کس قدر خود اعتمادی ہے اس ایک جملے میں اور پھر آدھ آسمان تک تیتنگ پہنچا کر تم نے ڈور کاٹ ڈالی بالم! ہر بول، ہر گیت کی الگ خاصیت ہے اپنا سا رنگ مگر جیسے ایک لڑی پروئی گئی ہو۔ ہر موتی الگ الگ ہونے کے باوجود لڑی ہی کا ایک حصہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ منحنی ادائوں میں سمویا ہوا اشارہ

کہ میرے کلیجے میں درد اُٹھا ہے۔ جاؤ اور رس سے بھرا ہوا لیموں لاؤ — جانے کیسی مسرت اور بے فکری ٹپکتی ہو گی اس بات تو نی محبوبہ کے چہرے سے جس نے پہلے پہل اپنے بالم سے یہ بات کہی ہو گی لیکن اس کے بعد — ذرا ان کیکروں کی اوٹ میں مجھ سے ملنے کے لئے آؤ ساجن! میں اپنے دل کی بات تم سے کہوں — اپنی چھنگلیا کا چھلّہ بطور نشانی مجھے دیتے جاؤ۔ تم لوٹ کر نہ آئے۔ رو رو کر جوانی بیت رہی ہے۔ ہائے رے چھنگلیا کا چھلّہ! اور سچ مچ جوانی بیت گئی اور وہ نہ آیا۔ پھر صبر کا پہلو اُجاگر ہونے لگا۔ وہ زندگی کی تلخ حقیقت پر غمگین ہونے کے بجائے اپنی عقل کے مُطابق اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگی — واہ واہ چرخے نے کیا خوب چیں چیں لگا رکھی ہے۔ پچھلا کاتا ہوا تو نکال کر پہن لیا لیکن پھر میں نے چرخے کو چھُوا تک نہیں۔۔۔۔۔۔ ہائے ری میں نے بالکل نہیں کاتا۔۔۔۔۔

ترنجن کی سہیلیاں بھی کیسے کیسے گیت لے بیٹھتی ہیں۔ چرخوں اور چرخہ کاتنے والیوں کا یہ مقدس رونا — چرچر، چیں چوں، چھنک چھنک، ٹھک ٹھک۔۔۔۔۔۔ لیکن میں چاہتا ہوں مجھے نیند آجائے۔ اور میں خواب میں دیکھوں کہ رجو نے اب تک کل کتنے بچے جن ڈالے ہیں؟

●

سمجھوتہ

وہ چھت سے نیچے اُتر آئی اور چوبارے میں بچھے ہوئے پلنگ پہ آلیٹی لیکن خیالات کا وہ لامتناہی طوفان بدستور اس کے ذہن میں مد وجذر بنا رہا۔ رفتہ رفتہ وہی مہمل سے خیالات نئے سرے سے اس کے ذہن میں اُجاگر ہونے لگے کہ جن کی وجہ سے وہ تمام رات ایک لمحہ کے لئے بھی نہ سو سکی تھی۔ رت جگے کے سبب اس کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا اور چہرے پہ خاص قسم کی تھکن کے آثار اُبھر آئے تھے۔

وہ اس قسم کی ذہنی اُلجھنوں اور بے قراریوں سے بخوبی واقف تھی۔ ایک مدت ہی سے تو اس کا دل اس قسم کے سوچ بچار میں پنپ رہا تھا۔ وہ بے ہنگم، غیر واضح سے خیالات تو جیسے اس کی زندگی کا ایک اہم ترین جزو بن کر رہ گئے تھے لیکن آج نہ جانے کیوں اُسے کچھ یہ محسوس ہو رہا تھا گویا زندگی میں پہلی بار اُس کے احساسات درد کی ٹیسوں میں اُلجھ رہے ہوں اور جیسے پہلی ہی مرتبہ اس کا

دل اس قسم کے دُکھوں کی وحشت سے آشنا ہو رہا ہو۔

اس کی آنکھوں کے ڈورے دودھیا ہو آئے تھے اور ڈیلوں سے کچھ ایسے ہی پھوٹ پھوٹ کر نکلتا ہوا سیاہ وسپید لاوے کی قسم کی مادّہ اُن کے کونوں پر ہلکے خاکستری رنگ میں جم چکا تھا۔ ہونٹوں پر کل کی ہستی کے چمکیلے رنگ نے بھی اِدھر اُدھر سے سمٹ کر پپڑیوں کی صورت اختیار کرلی تھی اور جگہ جگہ ان پپڑیوں کے اُکھڑ جانے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نہایت شدّت سے اپنے ہونٹ کاٹتی رہی تھی۔۔۔۔

اس کی عمر یہی پندرہ برس کی تھی شہروں کی تنگ اور غلیظ گلیوں میں بسنے والی عام لڑکیوں کی طرح دُبلی پتلی اور زرد رو لیکن کھٹی میٹھی چیزیں، چٹنی اچار وغیرہ کی دلدادہ ہونے سے جو شے شاید اس میں دو برس بعد پیدا ہوتی اس نے قبل از وقت ہی اپنا رنگ نکھار دیا تھا۔ اس عمر میں جو بھولپن کسی بھی کنواری کے چہرے سے جھلک سکتا ہے وہ گویا کسی نے بُری طرح سے کھرچ لیا تھا۔ اس کی ہنسی میں عجب قسم کی درشتی اور تلخی گھُلی رہتی جیسے ہنسنے پر اس کی روح کھِل کھلانے کے بجائے مُرجھا جاتی ہو۔ جیسے وہ ہنسنا تو چاہتی ہے۔ لیکن کسی نامعلوم طاقت نے اس سے یہ حق چھین لیا ہے۔

اس کا دل ہر وقت ایک ناقابلِ برداشت بوجھ تلے دبا رہتا تھا۔ عرصے سے ایک غیر معمولی خلا، ہر وقت اس کے ذہن میں پھیلتا سمٹتا چلا آرہا تھا۔ ہر سمے اُسے شدید تنہائی کا احساس ہوتا۔ ایک طرح کی ہوک اس کی آنکھوں میں بلبلاتی۔ یہ غیر معمولی خلا کسی طرح پُر ہو، یہ خیال آٹھوں پہر اسے مُضطرب رکھتا جسے اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود وہ ذہن کی گہرائیوں میں خلط ملط کرسکنے کے ناقابل ہو چکی تھی۔ وہ آتشیں

جذبہ کسی نہ کسی طور اُبھر ہی آتا کہ اس کے انگ انگ میں ایک تیزابی کیفیت برپا ہوجاتی۔

اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی بے باکی، خلوص اور التجا ایک ساتھ بھری رہتی۔ ہر جذبہ دوسرے پر سبقت لے جانے کی سعی کرتا۔ کبھی کوئی طاقت عود کر آتی، کبھی کوئی جذبہ غالب آجاتا۔ اس کش مکش کے ردِعمل سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ناممکن تھا کہ دراصل ان آنکھوں میں کیا ہے؟ وہ نگاہیں کیا کہنا چاہتی ہیں؟ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا گویا التجا کا جذبہ دوسرے ساتھیوں کو پچھاڑ کر کے نمایاں صورت اختیار کر گیا ہے اور نہایت ہی دردمندانہ انداز میں گڑگڑا رہا ہے — "کچھ ہو، واضح غیر واضح بس کچھ نظر آجائے۔"

اسے کائنات کی ہر چیز سے نفرت تھی۔ اپنے آپ سے، اپنے ان غیر اختیاری اضطراری کیفیات برپا کرنے والے اوٹ پٹانگ خیالوں سے، اپنی سہیلیوں سے جو بڑی چترائی اور دلجمعی سے اپنی محبت کے قصّے سُنا سُنا کر اس کے دل میں بھی کچھ اسی طرح اترانے اور فخر سے باتیں بنانے کا احساس پیدا کرتی تھیں۔ گھر کے کام کاج سے۔ کیا وہ اسی لئے پیدا ہوئی ہے کہ صبح سے شام تک کولھو کے بیل کی طرح گھر کے کام میں جُتی رہے۔ اُسے اپنے ماں باپ کے اس جھوٹے پیار سے بھی بے انداز نفرت تھی۔ جو خواہ مخواہ اس کے تئیں جتایا جاتا تھا۔ ماں باپ کی میٹھی میٹھی باتیں بھی اُسے بالکل ہی بے سرد پا معلوم ہوتیں۔ بلکہ اُسے غصہ آتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ان کے لاڈ پیار میں محبت کی نہیں، ہمدردی کی آمیزش ہے۔ ہمدردی جو کسی بھی بیگانے سے حاصل ہوسکتی ہے۔ رات کے دس بجتے ہی وہ چار بچوں کو اس کے سپرد کر کے

علیحدہ کمرے میں سونے کو چل دیتے تھے۔ اور بچے آدھی رات تک ریں ریں کرتے ہوئے اس کے لئے وبالِ جان بنے رہتے تھے۔ پھر وہ طویل، بھیانک اور تاریک راتیں، وہ تو ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں۔ ایک ایک رات میں وہ کئی کئی بار ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتی اور گم سم لیٹی ہوئی پہروں کمرے کی تاریک فضا میں اِدھر اُدھر آنکھیں بھٹکاتی رہتی۔ کبھی کبھی انتہائی کوشش کے باوجود سو نہ سکنے سے وہ کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر آسمان کی طرف ایک ٹک دیکھنے لگ جاتی جیسے کسی آسمانی طاقت کی راہ دیکھ رہی ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے ٹمٹماتے ہوئے ستارے اس کا مذاق اُڑانے لگتے۔ خاموش فضا، وحشیانہ قہقہے لگا کر اسے چڑانا شروع کر دیتی کہ وہ جھنجھلا اُٹھتی۔ کچھ یونہی دیوانوں کی طرح اس کا دل چیخنے چلّانے کو چاہتا۔ یہ ستارے مجھے کیوں اچھے نہیں لگتے۔ یہ چاند کیوں چاندنی بکھیر رہا ہے۔ یہ موت کا سا سکوت کیوں؟ یہ سب کیا ہے۔ یہ سب کیوں ہے؟ لیکن کوئی پھانس اس کے حلق میں پھنس کر رہ جاتی اور وہ پھر اپنے تئیں چارپائی پر گرا دیتی ــــــ

دن تو کسی نہ کسی حیلے کٹ ہی جاتا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں۔ گھر کے کام کاج میں اور اسے اس قسم کے خیالات سے قدرے نجات مل رہتی۔ لیکن جونہی شام ہونے کو آتی اس کا دل پھر بیٹھنے لگتا۔ اس وقت اسے کچھ اچھا نہ لگتا۔ ساری رات یونہی خیالات میں غلطاں و پیچاں رہنے کے احساس سے ایک جان لیوا سی افسردگی اس کے چہرے پہ دھرنا دے بیٹھتی اور اُداس مضمحل سی وہ یہاں وہاں گرنے پڑنے لگتی۔ یہ دن کب ختم ہوں گے یہ راتیں کب ختم ہوں گی؟ اُسے یقین ہو چکا تھا کہ جو وہ چاہتی تھی ایک آرزو ہی نا تمام ہی تھی۔

اس ذہنی انتشار اور اس قسم کی بیقراریوں کو اندر ہی اندر دباتے رہنے سے اس کا ذہن ایک طرح کی دلدل بن چکا تھا جس میں کئی طرح کی اُمنگیں، اُمیدیں اور تشنہ کامیاں اور حسرتیں دھنس کر رہ گئی تھیں۔ ہر لحظہ وہ کئی کئی ڈھنگوں سے اُبھر اُبھر پڑتیں اور تڑپ تڑپ کر اس کی تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچ لیتیں ـــــــ سوچو ہمارے لئے، ہماری رہائی کے لئے کچھ سوچو، ـــــــ

مگر وہ سوچ سوچ کر عاجز آ چکی تھی۔

بسا اوقات سوچتے ہی سے وہ اپنے خیالوں کی زندگی کو بھی پالتی تھی گوناگوں مسرتوں سے لبریز زندگی۔ زندگی کہ جس میں اُسے سوچنا نہ ہوگا۔ اس وقت اس کا ذہن کئی قسم کے ہوائی قلعے تعمیر کرنے لگتا۔ اُسے اپنے چاروں طرف سیکڑوں پیار بھری نگاہیں سرگوشیانہ انداز میں کچھ کہتی ہوئی دکھائی دینے لگتیں۔ اس احساس سے معاً پیاری پیاری لہریں اس کے جسم میں سرسرا اُٹھتیں۔ اس کی رگوں میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑنے لگتی جیسے وہ کسی نئے ولولے کسی نئی اُمنگ سے آشنا ہو رہی ہو۔ اس کا دل کسی نامعلوم خواہش کے زیر اثر جگمگا سا اُٹھتا اور خواہ مخواہ اس کا جی چاہتا کہ وہ ایک اٹوٹ قہقہہ فضا میں بکھیر دے کہ اسے گرد و پیش کی ہر شے ہنستی ہوئی نظر آنے لگے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے بجلی کے کوندے کی سی تیزی کے ساتھ کوئی دل شکن احساس اس کے قلب کی گہرائیوں سے اُبھر آتا اور کہرے کی صورت میں ہر گوشے پر چھا جاتا۔ اس پر ایک ہیبت سی طاری ہو جاتی ـــ پھر وہی بھیانک طویل راتوں کی گرانیاں۔ پھیکے اداس دن ـــ چھٹپٹاہٹ اور وہی اس کا وجود۔

کسی رات اسے کوئی سہانا شیریں خواب بھی دکھائی دے جاتا۔ جو بعد میں کئی کئی دن تک اس کے دل میں لذت انگیز گدگدی کرتا رہتا۔ پھر وہ ہر رات اسی قسم کے کسی خواب کی توقع میں اپنے دل میں رنگینی لانے کی کوشش کرتی۔ بارہا اسے محسوس ہوتا کمرے کی فضا میں میٹھے سپنے منڈلا رہے ہیں لیکن وہ ان تک کیونکر پہنچے۔ پوری کوشش کے باوجود بھی وہ انھیں پا سکنے میں کامیاب نہ ہوتی ــــــ

سورج کافی اونچا اُٹھ چکا تھا اور پچھواڑے کی جانب کھلنے والی کھڑکی میں لٹکتی ہوئی بھاری بھرکم کائی کانے کی چق سے ہلکی ہلکی دھوپ کی اُداس اُداس لہریں فرش پر جال سا بن رہی تھیں۔ اس جال پر اُچٹتی سی نگاہ ڈال کر اُس نے لیٹے لیٹے پورے زور سے ایک انگڑائی لی۔ اس کا انگ انگ چٹخ اُٹھا۔ اسی دوران میں اس کی ماں نے رسوئی گھر سے اُسے نیچے آنے کو آواز دی لیکن وہ اَن سُنی سی کرکے اسی طرح لیٹی رہی۔ اس کا ذہن ایک ماہ پہلے کی طرف پلٹ رہا تھا۔ وہ عجیب سی بات ابھی تک اس کے ذہن پر مرتسم تھی اور اکثر وہ بات اُسے یاد آجاتی تھی اس وقت بھی اپنے دل میں اُسے دہرانے سے وہ طنزاً ہلکا سا مسکرا دی۔ وہ بھاری بھرکم کائی کانے کی چق خود اُسی نے ماں سے یہ کہہ کر یہاں لٹکوائی تھی کہ وہ موا درزی یوں دیدے پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھتا ہے ــــ "بھینگا کلموہا ــــ" طنزیہ حقارت سے وہ بڑبڑائی۔ یوں دیدے ٹکا ٹکا کر دیکھتا تھا گویا اُسے اپنی آنکھ کے پھولے کا احساس ہی نہ ہو ــــ بڑا اسجیلا بنتا ہے۔ ہونہہ، کوئی اسے کہے کہ تمھیں تو کوئی چڑیل بھی دیکھنا گوارا نہیں کر سکتی۔

جب کبھی وہ کھڑکی میں جاتی۔ درزی یوں تیزی سے مشین چلانے لگتا گویا دکھانا

چاہتا ہو۔ میں دن بھر اسی رفتار سے مشین چلاتا ہوں اور میری باہوں کے پٹھے تھکتے نہیں ـــــ یونہی اُسے خیال آیا کہ وہ ذرا اُٹھ کر دیکھے کہ کیا وہ دوکان کھول چکا ہے۔ لیکن پھر نہ جانے کس خیال سے وہ اسی طرح لیٹی رہی ـــــ وہ ایک اور ہی حیران کن بات سوچنے لگی ـــــ آخر وہ کیوں اس شدت سے میری طرف تاکتا ہے جبکہ اسے اچھی طرح علم ہے کہ میں لنگڑی ہوں۔

وہ لنگڑی تھی۔ یہی غم اُسے گھُن کی طرح کھائے جاتا تھا اس کی ماں کے کہنے کے مُطابق بچپن میں کہیں وہ گھر کی سیڑھیوں سے لڑھک پڑی تھی جس سے دائیں ٹانگ کا ٹخنہ اُتر گیا تھا۔ بہتیرے حیلے کئے گئے مگر اصلی حالت پہ نہ ٹک سکا۔ یہ قصّہ اکثر اس کی ماں سائے ڈھلے گلی کی عورتوں میں بیٹھ کر چمٹی سے خربوزے تربوز کے بیج نکالتی ہوئی دہراتی اور جب وہ سب عورتیں اس کے بُرے نصیب پر چچ چچ کرنے لگتیں تو اس کے دل میں کئی قسم کے اضطراری شعلے ایک ساتھ بھڑک اُٹھتے۔ اس وقت اس کا جی چاہتا کہ وہ جانے بوجھے ایکبار پھر سیڑھیوں پر سے لڑھک پڑے اور اپنی دوسری ٹانگ کو بھی ناکارہ کرلے کہ وہ چل پھر تو نہ سکے گی۔ نہ کوئی اُسے دیکھے گا نہ اس کی حالتِ زار پہ افسوس کرے گا اس کے وقار کی ہیٹی تو نہ ہوگی۔

یوں وہ بناؤ سنگھار کی بڑی دلدادہ تھی۔ گھنٹوں آئینے کے سامنے کنگھی لئے وہ بال سنوارتی رہتی۔ اس کے بال گو چھوٹے اور چھدرے تھے۔ لیکن وہ ایک ایک لٹ کو چُن کر اس طرح جما لیتی کہ ان میں ایک عجیب قسم کی پھبن پیدا ہو اُٹھتی۔ وہ اپنے ابروؤں کے بال بڑی محنت کے ساتھ موچنے سے تراشتی کہ قدرتی بے ترتیبی ناپید ہو کر سہانا تناؤ آسکے۔ آنکھوں کی پلکوں پر کریم مل مل کر وہ اُنھیں دہرا کرتی اور کاجل

سرمہ کی سلائیوں کو اس ہنر مندی سے آنکھوں میں پھیرتی کہ چھوٹی ہونے کے باوجود آنکھیں کنپٹیوں تک لانبی دکھائی دینے لگتیں۔ پھر دل ہونٹوں پر مستی گھستی رہتی جس سے ہونٹوں میں غضب کی دل آویزی اور رسیلی چمک پیدا ہوا اُٹھتی تھی۔

کپڑے پہننے میں بھی وہ بڑی احتیاط برتتی۔ کس جمپر کے ساتھ کون سی شلوار کا میل ہے۔ چنری کے کون سے رنگ میں وہ زیادہ جاذب نظر دکھائی دے گی۔ آنچل کس طرح لہرائے کس ڈھنگ اوڑھنے سے لہریئے زیادہ چمک سکتے ہیں۔ ان سب باتوں میں اُسے کمال حاصل تھا۔ لیکن یہ سبھی جادو تو جیسے کسی بہت بڑے آسیب کے زیرِ اثر ہر دم روتے ہی رہتے۔ وہ غیر مطمئن تھی وہ یہ نہ چاہتی تھی کہ کوئی اسے دیکھ کر اس کی حالتِ زار پر افسوس کرنا شروع کردے، اس سے ہمدردی جتانے لگے۔ بلکہ وہ تو کچھ اور ہی چاہتی تھی۔ اس کی تسکین کا محض ایک ہی ذریعہ تھا کہ کوئی بھی نوجوان اُسے کسی اور ہی جذبے کے زیرِ اثر دیکھے ـــــ وہ سحر طراز جانا پہچانا جذبہ جو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی سہیلیوں کی طرح لڑکوں سے چھپ چھپ کر ملنا بھی نہیں چاہتی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی کہ کسی خوبرو نوجوان کے ساتھ پہروں بیٹھی پیار محبت کی باتیں کرتی رہے۔ کوئی اس کی تعریفوں کے پل باندھے۔ وہ تو صرف یہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے ان نگاہوں سے دیکھے جن نگاہوں کا تصور ایک مدّت سے اس کے خیالوں میں رچ چکا ہے ـــــ

دھوپ لمحہ بہ لمحہ گرمی پکڑ رہی تھی۔ اس کی ماں نے نیچے سے ایک اور آواز دی لیکن اس نے کروٹ بدل لی۔ سامنے گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں سُرمئی رنگ کا پھولدار پردہ ہوا کے دوش پہ لہرا رہا تھا اس کی طرف نظر جاتے ہی یک لخت

نہ جانے کیوں اُسے محسوس ہوا کہ وہ پردہ پھبتی آمیز قہقہے لگاتا ہوا اس پہ نہایت ذلیل فقرے کس رہا ہے۔ وہ چھٹپٹا کر اُٹھ بیٹھی۔ اس کا سانس قدرے زور سے چلنے لگا ایک بار اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ لپک کر اس پردے کو کھینچ لے اور چیتھڑا چیتھڑا کر کے ہوا میں اُچھال دے لیکن دوسرے ہی لمحے اُسے اس پردے سے ایک طرح کی وحشت آنے لگی گویا سچ مچ ہی وہ اس سے مخاطب ہو —— "سنہری سپنوں کا جال ٹوٹ چکا۔ مجھے ہی نہیں تم نے اپنے آپ کو بھی دھوکا دیا ہے۔ اب تڑپو۔ تلملاؤ کہ یہی انصاف ہے"——

اس پھولدار سُرمئی رنگ کے پردے سے اس کی کس قدر رنگین اور پیاری گھڑیاں چمٹی ہوئی تھیں۔ ایک ہی ہفتہ پہلے اس نے خود اپنے ہاتھوں اپنی ذرا سی پھٹی ہوئی ساڑھی پھاڑ کر کے یہ پردہ یہاں لٹکایا تھا گو اس میں اس کی ماں کا بھی ہاتھ تھا۔ تاہم اس پردے کے ساتھ ایک اور بھی پردہ پڑا رہے گا، اس نے اپنی ذرا سی پھٹی ہوئی ساڑھی پھاڑ دی تھی —— ایک ہفتہ —— یعنی کل سات دن —— وہ سوچنے لگی۔ کتنا مختصر وقت ہے۔ لیکن اس نے اس دوران میں کیا کچھ نہیں پایا۔ اس سنہری دور کا وہ پہلا دن جب اس نے مہندر کو سامنے کے مکان کے چھجے پر آرام کرسی پہ لیٹے پڑھتے دیکھا تھا۔ صبح ہی صبح جب وہ چوبارے کی اس کھڑکی میں آ کر کھڑی ہوئی تو ایک دم جیسے اس کا دل بول اُٹھا تھا۔ ہاں، جس کی تلاش میں تم برسوں سے سرگرداں ہو آج وہی تمہارے سامنے آ موجود ہوا ہے۔ یہ موسیقار تمہارے دل کے تاروں پر وجد آور نغمے گائے گا —— یہ مسیحا تمہاری صدیوں کی تڑپ ہرنے آیا ہے۔ اور واقعی مہندر کی ایک ہی میٹھی نظر نے اس کی تڑپ

ہر لی۔ صدیوں کا روگ مٹ گیا۔ اُسے دُنیا کی ہر شے مسکراتی اور خوشی سے ناچتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔

مہندر اُٹھ کر اندر چلا گیا لیکن وہ کتنی ہی دیر تک وہاں کھڑی رہی تھی کس قدر تعجب کی بات ہے، اس نے سوچا گھر کے بالکل مقابل کے مکان کو اس سے پہلے اُس نے غور سے نہیں دیکھا ـــــ وہ تو جب بھی اپنی کسی نئی سہیلی کو اپنے مکان کا پتہ بتایا کرتی تھی تو محض اتنا ہی کہ فلاں گلی میں ہے۔ دائیں ہاتھ کے تین چار مکانوں کے بعد پیلے رنگ کے چھجّے والے مکان کے ٹھیک سامنے ہی اس کا گھر ہے۔ بھلا وہ یوں کیوں نہ کہتی تھی کہ اس پیلے مکان کے چھجے کے جنگلے میں انتّیس سلاخیں ہیں جن میں سے تیرہ سلاخیں تو شاید دھوپ اور بارش میں رہنے کے سبب زنگ آلود ہو چکی ہیں لیکن باقی چھ پر لگا ہوا تار کول ابھی اپنی پوری آب پر ہے اس مکان کے دروازوں پر نہایت ہی چمکیلا سبز روغن کیا ہوا ہے۔ لیکن آتے جاتے تختوں کو چھوتے رہنے سے ان کے درمیانی حصّے کی کچھ جگہ مٹیلی بھی ہو گئی ہے۔ یا یہ کہ چھجّہ کافی کھُلا ہے اور وہاں بڑی آسانی سے آرام کرسی بچھا کر کوئی پڑھ سکتا ہے۔

اس واقعہ نے اُسے یکسر بدل دیا۔ اس کے قلب کی گہرائیوں سے نکلتی ہوئی درد و کرب کی چیخیں جانے کہاں دفن ہو گئیں اور ان کے بجائے نہایت لطیف تسکین دہ احساسات نے جگہ پالی۔ جیسے کسی لق و دق صحرا میں بھٹکتی ہوئی یکایک وہ کسی سر سبز رنگین وادی میں پہنچ گئی ہو۔ ایسی وادی جو اس کے خیالوں کی وادی سے بھی کہیں خوشنما تھی جہاں کرل کرل کرتے ہوئے ٹھنڈے، میٹھے پانی کے چشمے اس کی تڑپ اور تشنگی مٹانے کو محوِ انتظار تھے ـــــ اس میں ایک غیر معمولی پھُرتی آ گئی۔ گھر کے کام کاج میں بھی وہ

بڑی مستعدی دکھانے لگی۔ اس سے پہلے برتن مانجھنے سے وہ اکثر کنی کترا جاتی تھی اور اس وجہ سے اُسے ماں کے سیکڑوں کوسنے سننے پڑتے تھے لیکن اب وہ خود بخود ہی چٹکیوں میں برتن چمکا کر الماری میں جوڑ دیتی اور منٹوں میں دوسرے رسوئی کے کاموں سے بھی نبٹ جاتی۔ اپنے بہن بھائیوں اور ماں کے تئیں بھی وہ بڑی محبت جتانے لگ گئی تھی۔

لیکن اس کی ماں بڑی جہاں دیدہ عورت تھی۔ پہلے ایک دو دن تو اُس نے اس اچانک تبدیلی کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ عمر کا تقاضا سمجھ کر درگزر کرتی رہی لیکن جب پانی سر سے گذرتا ہوا دکھائی دیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ سامنے کے مکان میں آ کر بسے ہوئے نئے کرایہ دار کے لڑکے دھندر کو بھی وہ اکثر چھجّے پر بیٹھے اور اوپر کھڑکی کی طرف بار بار دیکھتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ لہٰذا کسی قسم کی انگشت نمائی کے ڈر سے اس نے کھلے طور پر تو کوئی قدم نہ اُٹھایا صرف اپنی لڑکی کو طرح طرح کی دلیلیں دیکر اور باتوں باتوں میں بات لگا کر سمجھانے کی کوشش کی۔ اور اسی کے کہنے پر ہی کھڑکی میں یہ پردہ لٹکا یا گیا تھا۔ لیکن وہ ماں کی آنکھ بچا کر دن میں بیسیوں مرتبہ کھڑکی میں چلی جاتی تھی۔

چوبارے کی یہ کھڑکی سامنے کے چھجّے سے قدرے اونچائی پر تھی۔ اس طرح چھجّے پر سے کھڑکی میں کھڑے کسی شخص کی کمر تک ہی کا حصّہ دکھائی دے سکتا تھا۔ پھر بھی وہ وہاں کھڑے ہو کر پردے کو اس انداز سے سرکائے رکھتی کہ دھندر صرف اس کا منھ یا زیادہ سے زیادہ چھاتیاں ہی دیکھ سکے۔

دن کو تو زیادہ تر ماں اسے نیچے اپنے پاس بٹھائے رکھتی تھی۔ لیکن رات کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہونے سے وہ اپنے بہن بھائیوں کو پچکار کر سلا کر کھڑکی میں چلی

جاتی۔ گو اس کی ماں ایک بار سونے کے لئے جا چکنے کے بعد پھر کبھی اس کے پاس نہ آتی تھی۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر وہ چوبارے کی بجلی بجھائے ہی رکھتی۔

چھجے کے اندر کی طرف کا دروازہ جھندر کے کمرے میں کھلتا تھا۔ جسے شاید وہ ہوا آنے کی غرض سے کھولے رکھتا تھا۔ کھڑکی میں سے وہ بخوبی اُسے پڑھتا ہوا دیکھ سکتی تھی۔ پہروں وہ اندھیرے میں کھڑی اسے تاکے جاتی۔ جھندر کو شاید اس بات کا علم نہ تھا وہ بے خبر اپنی پڑھائی میں مگن رہتا اور جونہی گھڑیاں بارہ بجاتیں اس کے کمرے کی بجلی بجھ جاتی۔ کئی بار اس کے دل نے بغاوت بھی کی کہ وہ کسی طرح اسے اپنی موجودگی کا احساس دلائے اور التجا کرے کہ خدارا کچھ دیر کے لئے اور رہ جاؤ ـــــــ تم اتنی جلدی کس طرح سو جاتے ہو ـــــ لیکن وہ بے دلی سے کھڑکی سے ہٹ جاتی۔

لیکن تیسرے دن کے بعد جھندر نے بھی کمرے میں بیٹھنے کے بجائے باہر چھجے پر آکر ٹہلنا اپنا معمول بنا لیا۔ کبھی کبھی وہ سیدھا کھڑا ہو کر اس کی طرف ٹکٹکی بھی باندھ لیتا۔ کوئی اشارہ یا بات تو نہ ہوتی لیکن اس دن کے بعد دونوں ہی اس دھن میں رہنے لگے کہ ایک دوسرے سے پہلے مخصوص جگہ پہ پہنچ جائیں۔ اسے گھر کے کام کاج میں اکثر دیر ہو جاتی۔ ماں کوئی بیگار ڈال دیتی یا بچے ہی سونے کا نام نہ لیتے تو وہ جھنجھلا جھنجھلا کر اس اونچی آواز میں اُنھیں ڈانٹتی کہ جھندر۔ اگر چھجے پہ پہنچ چکا ہے تو اس کی آواز اس تک پہنچ سکے یا اگر ماں جاگ رہی ہے تو اسے کسی قسم کا شُبہ نہ ہو اور جونہی سب صحیح ٹھیک دیکھ کر وہ کھڑکی میں آ کر جھندر کو انتظار کرتا ہوا پاتی تو اس کا رُواں رُواں خوشی سے کھل اُٹھتا۔

اب اس کی سہیلیاں جب اُسے ملنے آتیں اور حسبِ معمول اپنے کسی محبت کے قصے کو نمک مرچ لگا کر بیان کرتیں تو خلافِ معمول وہ ان میں زیادہ دلچسپی لینے لگتی۔ بات بات پر وہ کھِل کھِلا اٹھتی گویا ان کی محبت کا مذاق اُڑا رہی ہو ـــ "اچھا کل اس نے تمہاری گلی میں بارہ چکّر لگائے ـــ" اور یہ کہتے ہوئے وہ قہقہے لگا کر ہنسنا شروع کر دیتی۔ ہنستے ہنستے اُسے اُدھو آنے لگتا۔ کئی بار اسے بھی خیال آیا کہ وہ ان سے کہے آخر میں بھی تو محبّت کرتی ہوں، ہماری طرف دیکھو۔ وہ میری بابت سوچتا ہے میں اس کی بابت سوچتی ہوں اور بس! اور یہ جو تم گلیوں کے چکّر کاٹنے والی باتیں سنا رہی ہو۔ یہ سب لغویات ہیں ـــ فضول ـ واہیات ـــ

مگر وہ اپنے تصوّر کی کل یکسوئی کے باوجود کچھ بھی کہنا پسند نہ کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی سہیلیاں اس کا مذاق اُڑانے لگیں گی۔ ایسے ایسے دل شکن فقرے دہرائیں گی کہ اس کی روح کا ہر ذرّہ رو اُٹھے گا۔ کسی کو بھی اس کی باتوں پر یقین نہ آئے گا۔ وہ سب تو شاید یہی سمجھے بیٹھی ہیں کہ دُنیا بھر کے کسی بھی شخص کی دلچسپیوں کا مرکز اگر کوئی ہو سکتا ہے تو محض انہی کی ذات۔ ہونہہ! وہ سوچتی، یہ خود اعتمادی در اصل کس قدر بے وقعت ہے اُسے یاد تھا کہ اسی شانتی کا چاہنے والا جس کے متعلق وہ بڑی بڑی ڈینگیں مارا کرتی تھی اور جس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے تک ملاتے نہ چوکتی تھی، پچھلے دنوں گھر کی نوکرانی کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔

سُرمئی رنگ کا پھولدار پردہ بدستور ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا اور کائی کانے کی بوجھل، گُم سُم حِیْق ـــ سے چھن کر آتی ہوئی دھوپ کمرے میں گرمی بھر رہی تھی۔

پردے کی طرف دیکھنے سے پھر اس کے سینے میں کسک سی ہوئی اور اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتما اُٹھا۔ کسی غیر مغلوب خواہش کے زیرِ اثر ایک دم اس کے ذہن میں خیال اُبھرا کہ وہ ایک لمحہ کے لئے پردے کی اوٹ میں جاکر کھڑی ہو جائے۔ یونہی ــــ لیکن فوراً ہی بعد پھر اُسے اپنے اس احساس سے بھی وحشت سی آنے لگی۔ پردہ جیسے پھر کچھ کہنے کو دکھائی دیا ــــ

وہ تن کر سیدھی لیٹ گئی اس کی پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی۔ آنکھیں آبگوں ہو آئی تھیں اور اس کا ذہن کسی فیصلہ کن راہ پہ چلنے کے بجائے اِدھر اُدھر بھٹکنے سے جواب دینے لگا۔ نڈھال سی ہو کر وہ چھت کی کڑیاں گننے لگی لیکن اس سمت بھی اس کا دھیان زیادہ دیر نہ جم سکا۔ سینے کی آگ اور زور سے بھڑکنے لگی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے اور وہ سِسک سِسک کر رونے لگی۔

ماضی کی اس کے تئیں سرد مہری اور مستقبل میں بھی روشنی کی کسی ہلکی سی کرن کے لئے نا امیدی سے اس کے چہرے پر مُردنی سی چھا گئی ــــ بیاہ ــــ یکایک یہ خیال نہ جانے اس کے ذہن کے کس گوشے سے اُمڈا اور تھوڑی دیر کیلئے اس خیال نے اُسے ذرا سی قوت بخشی۔ اس نے آنسو پونچھ ڈالے لیکن پھر جب وہ اپنی گذشتہ زندگی کا تجزیہ کرنے لگی تو اسے یہ خیال بھی محض دل بہلاوے ہی کا ایک سامان معلوم ہونے لگا۔ کئی بار اس کی سگائی کا چرچا اُٹھا تھا جس دن لڑکے والوں کی طرف سے کسی عورت کی آمد آمد ہوتی وہ لگاتار کئی کئی گھنٹے نوک پلک درست کرنے میں گذار دیتی۔ لیکن جونہی اس عورت کا سامنا ہوتا ساری سحر انگیزی

ٹوٹ جاتی۔ خودنمائی کا جادو اپنے ہی سر چڑھ کر بول اُٹھتا۔ اسے انتہائی یقین ہوچکا تھا کہ کسی بھی حالت میں وہ شادی کے قابل نہیں سمجھی جاسکتی۔ کبھی کبھی اُسے یہ خیال بھی گذرتا کہ یہ جو چہروں پر چیچک کے بدنما داغ، پھلبہری کے نشان چمیٹے موٹی، بھدّی، کالی، بھینگی، سیکڑوں عورتیں گھروں کی رانیاں بنی بیٹھی ہیں۔ یہ بھلا کیونکر قبول کی گئی ہونگی؟ اور اس خیال سے اس کے دل کو ذرا دیر کے لئے ڈھارس بندھ جاتی کہ شاید۔ شاید۔ لیکن جونہی یہ پیوند لگتا کہ ممکن ہے یہ سب کچھ شادی کے بعد ظہور میں آیا ہو تو وہ اپنی ہی قسمت پر لعنت ملامت کر کے خاموش ہوجاتی۔ کاش کہ قدرت نے اسے لنگڑی نہ کیا ہوتا۔ شادی ہوجانے کے بعد چاہے اس کے کُل جسم کو فالج مار جاتا ــــ وہ کوڑھی ہوجاتی ــــ

نیچے سے ماں کی ایک زوردار آواز نے اس کے خیالات کے تسلسل کو توڑا۔ اُسے خیال آیا کہ اُٹھ کر نیچے چلی جائے۔ ماں جانے اس کے متعلق کس واہمے میں مُبتلا ہوگی۔ لیکن پھر اسے اپنی ماں پر بھی غصہ آنے لگا۔ وہ سوچنے لگی آخر یہ سب اُسی کی تو لگائی ہوئی ہے۔ اگر وہ کل پڑوسن کے ہاں نہ گئی ہوتی تو.......

کل کے واقعے کی تصویر آنکھوں کے سامنے آتے ہی اس کی آنکھیں پھر نمناک ہو اُٹھیں۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ماں پڑوسن کے یہاں گئی ہوئی تھی کہ موقع ہاتھ آتے ہی وہ بھی کھڑکی سے جا لگی۔ سامنے جہندر بھی کرسی بچھائے پڑھ رہا تھا۔ آج پہلی مرتبہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے ــــ وہ

کس قدر چالاکی سے کتاب کو سینہ تک سرکائے بظاہر پڑھنے میں منہمک نظر آتا تھا مگر اس کی آنکھوں کی آسیبی چمک سورج کے سامنے رکھے ہوئے آئینے کے لشکارے کی طرح اس کی آنکھوں میں پیوست ہوئی جا رہی تھی۔ ان آنکھوں میں کیا کچھ نہیں ہے؟ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ یکایک پڑوسن کی لڑکی نے جو اس کی سہیلی بھی تھی اُسے نیچے گلی سے پکارا۔ انہی کے ہاں سے ماں نے اس کو بلانے کے لئے اُسے بھیجا تھا۔ دفعتہً بجلی کے جھٹکے سے جس طرح کوئی سر سے پاؤں تک لرز اُٹھتا ہے وہی کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔ وہ کیونکر گلی میں جائے گی؟ یہ خیال اُسے کسی غیر معمولی طوفان کا پتہ تو معلوم ہونے لگا۔ اس کے جسم کے ہر حصے میں ایک ہیجان اُمنڈ پڑا۔ اسے محسوس ہوا گویا ماں اس سے کسی پچھلے جنم کا انتقام لینا چاہتی ہے۔

اس کی سہیلی اب اوپر اس کے پاس آچکی تھی اور ساتھ چلنے کو کہہ رہی تھی۔ اس نے سر درد کا بہانہ کیا پھر پیٹ درد، حتیٰ کہ ہر درد گن ڈالا۔ کئی اور بھی بہانے بنائے مگر اس نے ایک نہ سُنی اور آخر اُسے کھینچتی ہوئی نیچے لے ہی گئی۔ اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ سارا جسم کانپ رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر ایکبار اُسے خیال آیا کہ وہ ذرا سی دیر میں آنے کو کہہ کر اوپر کھڑکی میں چلی جائے اور بے باکانہ انداز میں گڑگڑا کر دھندر سے التجا کرے کہ اے میری روح کے نور، میرے مسیحا، آج تک میں نے تجھ سے بات تک نہیں کی۔ چاہت بھری نگاہوں کی دین کے علاوہ کچھ نہیں چاہا۔ آج میں جھولی پھیلا کر تجھ سے ایک بھیک مانگتی ہوں۔ خدارا تھوڑی دیر کے لئے اندر کمرے میں چلے جاؤ۔ مگر وہ

ابھی تک پوری طرح یہ سب سوچ بھی نہ پائی تھی کہ اس کی سہیلی گھسیٹ کر اُسے باہر لے گئی ——

اس پر غشی کا سا عالم طاری تھا۔ کل جسم سے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ کاش اس وقت زمین پھٹ سکتی کہ وہ اس میں سما جاتی۔ اپنی سہیلی کا کندھا تھامے رہنے اور ٹانگ کو پوری قوت سے اکڑانے کے باوجود اس کا پاؤں گھوم کر لڑکھڑا ہی جاتا۔ ہر قدم پر اُسے محسوس ہوتا گویا سیکڑوں بچھو ایک ساتھ اس کے جسم پر ڈنک چلا رہے ہوں۔

ماں کی باتوں پر وہ پوری طرح سے توجہ نہ دے سکی۔ ہر لحظہ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ صرف اتنی ہی بات اس کی سمجھ میں آسکی کہ تمہارے پتا جی کے آنے کا وقت ہو گیا ہے چولھے پر چائے کے لئے پانی رکھدو اور نیچے اپنے بہن بھائیوں کے پاس بیٹھو۔

وہ جلد ہی واپس لوٹ آئی آتے ہوئے اس نے اوپر چھجے کی طرف دیکھا۔ جھنڈ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گرتی پڑتی سیڑھیاں طے کر کے جب وہ چوبارے کی کھڑکی میں پہنچی تو جھنڈ چھجے پر موجود نہ تھا۔ چھجے اور کمرے کو ملاتا ہوا رات دن کھلا رہنے والا دروازہ بھی بند ہو چکا تھا۔

شام تک وہ کھڑکی سے نہ ہٹی۔ ماں نے جب اوپر آکر چوٹی سے پکڑ کر کھینچا گالیوں اور دھول دھپوں کی بوچھار کی تب کہیں وہ نیچے اُتری۔ باپ الگ خفا ہو رہا تھا۔ لیکن اُسے تو اب جیسے کسی کی پرواہی نہ تھی۔ جیسے وہ کچھ سُن ہی نہ رہی تھی۔

رات بھی وہ آدھی رات تک کھڑکی میں کھڑی رہی۔ لیکن اس کے دل کی طرح سامنے کا چھجہ بھی ویران ہی رہا۔

وہ جانتی تھی کہ اب وہ دروازہ کبھی نہ کھلے گا۔ پھر جانے اس خیال سے وہ وہاں جمی رہی کہ گزشتہ سات دنوں کی اس زندگی کو وہاں سے کھرچ کر اپنے دل میں سنبھال کر رکھ لے۔ ماضی کی طرح پھر جب خیالات کا تصادم ہوگا تو اسے اپنی اس زندگی سے تھوڑی بہت تو تسکین مل سکے گی۔

چھجے کے دروازے کی درزوں میں سے تیز دھاری کٹاریوں کی صورت میں اس کے کلیجے کو چھلنی کرتی ہوئی بجلی کی روشنی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ پڑھ رہا تھا۔ "یقیناً وہ پڑھ رہا ہوگا۔" اس نے سوچا۔ اُسے تو کچھ بھی نہیں ہوا اتنے بڑے انقلاب کا اثر کائنات کی کسی بھی چیز پر تو نہیں ہوا۔ ستارے اُسی طرح جھلملا رہے ہیں۔ چاند چاندنی بکھیر رہا ہے۔ لوگ نیند میں گھوک سو رہے ہیں...... یہ خوفناک طویل بھیانک رات۔ یہ تنہائی۔ یہ خلا ——

اس کی حالت پیاس سے مرتے ہوئے اس انسان کی سی تھی، جس کے ہاتھوں میں ٹھنڈے پانی سے لبالب پیالہ دیکھ پھر اُسی دم چھین لیا گیا ہو۔ جس نے صدیوں کی تشنگی کو دبا کر اس ساعتِ خوشکن کا انتظار کیا ہو۔ اور جو ناکام ہونے کی صورت میں بجھتے ہوئے دیئے کی لَو کی مانند بھڑک اُٹھے۔

اس کا دھیان پھر پردے کی طرف گھوم گیا۔ ہوا کے زور سے پردہ بدستور پھڑپھڑا رہا تھا —— ان تھک زبان سے کہے جا رہے وہ فقرے اس کی روح کو تڑپانے لگے —— سنہری سپنوں کا جال ٹوٹ چکا۔ مجھے ہی نہیں تم نے اپنے

آپ کو دھوکا دیا ہے۔ اب تڑپو، تلملاؤ کہ یہی انصاف ہے۔ کسی غم یا غصّے کے بجائے وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی گویا گرد و پیش کی ہر شے سے پوچھ رہی ہو۔ "کیا سچ مچ یہ انصاف ہی ہے؟"

پھر غیر ارادی طور پر اس کی آنکھیں چپ چاپ لٹکتی ہوئی کائی کا نے کی بوجھل چق کی طرف اُٹھ گئیں اور ایسے ہی وہ سوچنے بھی لگی۔ آخر اس چق پر ہوا کے جھونکے کیوں اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہ کیوں خاموش ہے؟ ــــــ کہ یکایک اس چق پر تیز تیز ہاتھوں سے مشین چلاتا ہوا درزی اُبھر آیا۔ اور جیسے اس کی آواز بھی واضح طور پر سنائی دینے لگی۔ "میں سب انقلابوں سے بے نیاز ہوں ــــ میں سب انقلابوں سے بے نیاز ہوں۔"

وہ دونوں کھڑکیوں کے درمیانی فاصلے کا جائزہ لینے لگی۔ صرف ایک ثانیہ کے لئے اس کے ذہن کے کسی گوشے سے کوئی جذبہ پکارا ــــ "ایک خلیج ہی تو ہے، گہری، ناقابلِ عبور"۔ ــــ لیکن دوسرے ہی لمحے کسی خوفناک عزم کے دبدبے سے گویا وہ جذبہ پھر ذہن کی گہرائیوں میں لڑھک گیا۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔

چند ہی لمحوں کے بعد گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کائی کا نے کی بوجھل چق سے ڈھک گئی اور پچھواڑے کی کھڑکی میں پھولدار پردہ ہوا کی لہروں پر ناچنے لگا۔

●

طوفانوں کے بیچ

چوپٹ کے چاروں کونے چت لیٹے ہوئے تھے۔ سبز، سرخ، سیاہ اور زرد گٹیاں مختلف سمتوں سے ایک ہی مخصوص راہ پر گامزن تھیں۔

متواتر ایک گھنٹے سے ہر پلڑے کی جانب سے کوڑیاں اچھال اچھال کر اور چہرے بدل بدل کر وہ اکتا سا گیا تھا ——— راجی نہ جانے کب آ چکے گی۔ انتہائی بیقراری کے عالم میں ہر لمحہ اس کا ذہن اس خیال میں اُلجھ کر رہ جاتا اور اُلجھتے سُلجھتے ڈانواں ڈول سے خیالات اس کے ذہن کو کہیں سے کہیں بھٹکا دیتے۔ ہر لحظہ اس کی آنکھیں دروازے کی طرف گھوم جاتیں۔ اور ذرا سی آہٹ پر وہ چونک اُٹھتا۔ اور غیر اختیاری طور پر اس کے ہاتھ چوپٹ کی طرف اُٹھ جاتے کہ جس کی شکنیں وہ ان گنت بار سنوار چکا تھا اور اسے اپنے اندر کوئی چیز بیٹھتی ہوئی سی محسوس ہونے لگتی۔ اس ایک گھنٹے میں اس نے ترتیب سے کوڑیاں پھینکنے

کے کئی ڈھب جان لئے تھے۔ اور اپنے اس احساس کے تحت اُسے یک گونہ مسرت بھی محسوس ہورہی تھی کہ اب راجی اُسے ہر موقع پر مات دینے میں کامیاب نہ ہوسکے گی۔

...... طویل تر ہوتے ہوئے انتظار کی شدت سے جھنجھلا کر ایکبار اس نے سوچا کہ وہ اپنے میزبان کو چوپٹ پر بیٹھنے کے لئے بلائے کہ اس طرح کچھ وقت تو آسانی سے کٹ جائے گا مگر اس کے ساتھ ہی جب اسے خیال آیا کہ اس کا میزبان اگر ایک بار چوپٹ پر جم گیا تو شام سے پہلے اُٹھنے کا نام نہ لے گا۔ جو ہو، اس نے تنہا بیٹھنے میں ہی مصلحت سمجھی —— اس وقت یہ قیاس بھی اس کے لئے ناقابلِ قبول تھا کہ اس کا میزبان یا کوئی اور شخص راجی اور اس کے درمیان حائل ہو۔

کل بھی وہ کس قدر چاہتا تھا کہ میزبان اور اس کی بیوی کسی طور چوپٹ سے اُٹھ جائیں۔ راجی کے کنائے استعاروں کی گفتگو اُسے بے طرح بے قرار کر رہی تھی۔ مگر وہ تو اس نئے کھلاڑی کے ہر پانسے کا رُخ جاننے کے لئے گویا بہت ہی بے تاب تھے۔ ہر حکّے پر ان کی نظریں اس کے ہلتے ہوئے ہاتھ پر ہچکولے کھانے لگتیں اور کوڑیاں اُلٹتے ہی وہ بے اختیار آہ یا واہ کا شور مچانے لگتے۔ ان کی ہر مخلصانہ حرکت پر وہ دل مسوس کر رہ جائے، اس کے علاوہ اس کے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ برابر کوڑیاں اُچھالتا رہا۔ چہرے بدلتا رہا اور اپنی جھنجھلاہٹ کو دبانے کی کوشش کرتا رہا —— ادھر راجی کی آنکھیں موقع پاتے ہی اس کے چہرے پر جم جاتیں —— اس کی اس چوری کو اس نے کئی بار پکڑا

نہ جانے وہ وہاں سے کیا ڈھونڈنا چاہتی تھیں۔ ہر مرتبہ ان آنکھوں میں عجیب عجیب لہریں تھرک اُٹھتیں۔ کبھی وہ معصوم بچے کی آنکھوں کی طرح دلفریب، چنچل اور پاکیزہ ہو جاتیں۔ کبھی ان میں کنواری دوشیزاؤں کی آنکھوں کی خاموشی اور بے باک فریادیں جھومنے لگتیں۔ اور کبھی وہاں عمر بھر غموں میں پنپتی رہی کسی بڑھیا کی آنکھوں کی سنجیدگی اور ریاکاری دھرنا دیے بیٹھتی۔ زندگی کی ان تین مختلف کیفیتوں کا بیک وقت مکمل امتزاج اسے از حد ناگوار گذرا۔ مگر بعد میں اسے یہ دیکھکر اور بھی حیرت ہوئی کہ وہاں کی کسی بھی عورت میں زندگی کی ان تینوں مختلف حالتوں کو علیحدہ علیحدہ دیکھ سکنا ناممکن ہے۔ کیا بچپن، کیا جوانی اور کیا بڑھاپا ۔۔۔ چوپٹ کی گٹیوں کی طرح اپنے چیروں اور خانوں میں بے طرح اُلجھ کر رہ گیا تھا۔

۔۔۔ راجی کی آنکھیں مختلف رنگ بدل رہی تھیں۔ خاموش لیکن بیباک فریاد کرتے ہوئے ان میں کتنا درد کتنی امید اور التجا بھر جاتی۔ جانے ان میں کیا کیا شکوے کیا کیا فریادیں مضمر تھیں۔ ان پُر ملال اور بے چین نگاہوں کی اوٹ میں اُسے کئی کمسن روحوں کی پھڑپھڑاہٹ محسوس ہوئی۔ جنھیں کئی صدیاں کئی تہذیبیں کند چھری سے ذبح کرتی آئی تھیں۔ اس ماحول اور زندگی کے خلاف بغاوت کے آثار، دل کے تہاخانے میں برسوں سے چھپائی ہوئی خلش آنکھوں میں سمیٹ کر وہ پہلی ملاقات میں ہی ایک ایسے پردیسی کی آنکھوں میں انڈیل رہی تھی جو پہلی مرتبہ وہاں آیا تھا۔ اور جسے شاید پھر کبھی وہاں نہ آنا تھا ۔۔۔ عجب دل لگی ہے، اس نے سوچا، کسی اَن دیکھے بالم کے انتظار میں فرشِ راہ کی ہوئی یہ آنکھیں ہر پردیسی کو اپنا بالم سمجھ بیٹھتی ہیں۔

راجی ان کے یہاں اس کے ساتھ چوپٹ کھیلنے کی غرض سے آئی تھی۔ اس کے میزبان نے اُسے ایسا ہی بتایا تھا ـــــ شائد یہ بھی یہاں کا کوئی دستور ہوگا۔ اس نے سوچا، کیونکہ وہاں کا ہر رہ داج ہر روائت اس کے لئے ناقابلِ فہم تھی۔ جب وقت سے اس کا پیر اس علاقے میں پڑا تھا وہ عجیب کش مکش میں مبتلا تھا۔ وہاں کی ہر شے، ہر شخصیت اس کے لئے عجیب، وغریب تھی۔ جھلسے ہوئے پژمردہ چہرے، بے نور لہجہ، بے نور زندگی، نہ کوئی لطافت نہ رنگینی ـــــ بغیر کسی آرزو کے جینا اور بے مقصد جیتے جانا۔ ہر بشر کی آنکھوں میں اور روح میں ایک والہانہ بھٹکار رچی ہوئی تھی اور اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہزاروں سال قبل کے اس زمانے میں جا پہنچا ہو۔ جب انسانی نسل اپنے ابتدائی دور میں تھی اور وہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ وہ زمانہ بھی کیا زمانہ ہوگا ـــــ نہ حقیقت وخیال سے جنگ، نہ کوئی تگ ودو ـــــ یہ صدہا لوازمات سے عاری، فرسودہ زندگی ـــــ یہ مجرمانہ کیفیت ـــــ آخر یہاں کے لوگوں کے لئے سوالیہ نشان کیوں نہیں بنتی؟

اور وہاں آنے سے قبل کافی دنوں تک وہاں قیام کرنے کی جو گرہ اس نے اپنے دل میں باندھی تھی وہ پہلے روز ہی ڈھیلی ہو کر کھل گئی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی قیمت پہ بھی اپنی زندہ دلی اور رومان پسندی کو اس مخصوصیت اور افسردگی میں گھل جانے کی اجازت نہیں دے سکتا اور عین ممکن تھا کہ دوسرے ہی دن وہ اپنا بوریا بستر سمیٹ لیتا کہ راجی سے اس کی ملاقات ہو گئی اور اُسے

یک لخت اپنے ارادے کو ملتوی کرنا پڑا۔ راجی ہی کے سبب اس کے دل میں اس مجرم سرزمین پر بسنے والے مظلوم لوگوں کے لئے ہمدردی کا ایک دیا جل اُٹھا۔ مجرم اور مظلوم کی یہ خوفناک ہم آہنگی۔ اس کے خیالات پنپترا بدل گئے کیا یہ بے چارگی کسی حیلے فنا نہیں ہوسکتی؟ یہ بے سروسامانی، دیوانگی، اَن گنت صدیوں کی جہالت محدود زندگی کہ جس میں ظاہرداری تک کا کوئی لوازم نہیں۔

راجی کے علاوہ کئی اور لڑکیاں بھی اس کے دیکھنے میں آئیں۔ کئی ایک سے چوپٹ کھیلنے کا موقع بھی ملا۔ مگر ان سب میں ایک ہی طرح کے جذبات؛ وہی غمناکی اُسے دکھائی دی کہ جس کا اپنی صنف کے متعلق راجی مکمل تعارف کرا گئی تھی ــــ کسی لڑکی کی آنکھوں میں کاجل نہیں تھا۔ وہ سوچتا، یہ تو بالکل ناممکن ہے کہ یہ آنکھیں کاجل رچانا پسند ہی نہ کرتی ہوں۔ ان کے سوکھے پھیکے ہونٹ، زرد خشک رخسار دیکھ کر اس کی آنکھوں میں وہ منظر گھوم جاتا جب اس علاقہ کی سرحد شروع ہوتے ہی جھکڑوں کی صورت میں اُڑتی ہوئی بے پناہ ریت نے اس کا استقبال کیا تھا ــــ روح کے دریاؤں سے نکلتی ہوئی وہ مظلوم مسکراہٹیں جب اپنے اندر شہد آگئیں، چمک سمونے کی کوشش کرتیں تو عجیب اجنبیت کا مظاہرہ ہوتا۔ بجلیوں کے کوندے مستعار لینے کی کوشش میں ان کی آنکھوں کی گہرائیوں کا الم یہ بھول جاتا کہ اس سرزمین پر پھیلے ہوئے ہٹیلے آسمان پر تو کبھی بادل ہی نہیں اُڑتے ــــ من سمجھوتے کی خاطر وہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا فیصلہ نہ دے سکا کہ وہاں کی لڑکیوں میں جوانی آکر خود پشیمان ہوجاتی ہے ــــ عورت کی زندگی کا یہ مختصر مگر عظیم حصّہ تو ماحول ہی کا رہینِ منت ہوتا

ہے اور یہاں بادل نہیں اُمڈتے، رم جھم جھڑیاں نہیں لگتیں، آندھیاں آتی ہیں چاروں طرف لق ودق سنسان ریگستان ـــــ اور ملک میں یہی ایک بدنصیب سرزمین ہے۔ جس پر سورج دیوتا حد سے زیادہ مہربان ہیں۔

اسے وہاں کی ہر شے فریاد کرتی ہوئی دکھائی دی۔ وہاں کی زمین۔ وہاں کا آسمان سبھی فریادی تھے ـــــ وہ سوچتا، زندگی چاہے جس دور میں بھی ہو کوری فریادیں چارہ گر نہیں ہو سکتیں۔ محض آہ و زاریوں پہ ہی آس جمائے رکھنا تو صریحاً خود فریبی ہے ـــــ خود فریبی اور جہالت اور جاہل چاہے کوئی فرد ہو، چاہے ساری قوم، کبھی اپنا نصب العین نہیں پا سکتی۔

اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے جھونپڑی نما مکانات ان کی طرزِ معاشرت کا المناک منظر پیش کر رہے تھے۔ بس سر چھپانے کی جگہ تھی کہ ہر کوئی چھپائے بیٹھا تھا۔ عورتیں کہ جن کی زندگی میں گھر سجانے اور بناؤ سنگھار کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ وہاں بے طرح کھوکھلی ہو گئی تھیں۔ کسی بھی دوسری طرف مائل ہونے کے بجائے انھیں چوپٹ ہی سے والہانہ عشق تھا۔ کچھ عورتوں تک ہی محدود نہ تھا وہاں کے تو ہر بشر کی زندگی کا مقصد ہی جیسے چوپٹ تھا۔ دوکانداروں کے ہاں ایک بار سودا سلف ختم ہوتا کہ وہاں مہینوں کے لئے چوپٹ کا اکھاڑہ بن جاتا۔ دوبارہ لانے کی نہ وہ خود ضرورت محسوس کرتے نہ خریدار زور دیتے۔ کھیت تھے مگر یوں معلوم ہوتا تھا کہ برسوں سے ہل سہاگے کی شکل کو ترس رہے ہیں۔ جا بجا خود رو سرکنڈے

اور آک بھانگ اُگ رہی تھی۔ بٹی سونا اگلنے کو تیار تھی مگر کوئی اس طرف توجہ نہ دیتا تھا۔ وہاں کی ہر شے گویا اپنے آپ ہی کو حیرت سے تک رہی تھی۔ دن ڈھلتے ہی گلی بازار سب سونے ہوجاتے اور طوفان آنے سے قبل جو خاص قسم کا حبس فضا میں بکھر جاتا ہے وہی کیفیت طاری ہوجاتی ـــــ اور وہ بے بس ہو کر سوچنے لگتا، یہاں کی زندگی سے طوفان کس قدر وابستہ ہیں۔ ٹھیک ہی تو ہے آخر کیا فائدہ؟ کون جانے کس وقت دریا میں طغیانی آجائے۔ اور جس طرف مُنھ اُٹھے بھاگنا ہو۔ قضا سر پر منڈلا رہی ہو تو غلّے دولت کے بھنڈار کس کام ـــــ سب کیا دھرارہ جائے گا پھر حرص و طمع سے جی کو روگ لگانے سے حاصل!

اس وقت وہ قصبہ دریائے سندھ سے دو کوس کے فاصلے پر تھا۔ طغیانی آنے کی صورت میں لوگ گھروں کو خیرباد کہہ کر پانی کے آگے آگے اوپر کی طرف بڑھنا شروع کر دیتے تھے لیکن ایک طوفان سے بچاؤ کی خاطر وہ دوسرے طوفان کے اور قریب چلے جاتے تھے ـــــ اوپر منھ زور خونخوار بلوچوں کا علاقہ تھا جو میلوں کی مسافت کے باوجود رہی سہی کسر پوری کرنے چلے آتے تھے اس کے میزبان نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ سندھ کا طوفان تو چھوٹے بڑے، عورت مرد سب کے لئے یکساں تباہی کا باعث ہے۔ مگر اوپر کی طرف سے اُمڈنے والا یہ طوفان صرف نوجوان لڑکیوں کو ہی اپنی لپیٹ میں لیتا ہے۔

ان دو طوفانوں کی پیہم زدوں میں گھرے ہوئے گھربار اور عزّت لٹائے ہوئے وہ لوگ مایوسیوں اور مجبوریوں کی تہوں میں کرب آمیز جھنجھلاہٹ لئے

ہوئے گویا زبردستی جی رہے تھے۔ طوفانوں نے ان کی زندگی پر بے طرح چھاپا مارا تھا ـــــ دلوں پر منڈلاتے ہوئے مستقل خطروں کی وحشت نے ان کی زندگی بے رنگ دیوار مفلوج کر دی تھی ـــــ اور وہ سوچتا، صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلی آ رہی بے کلی اور بے بسی نے جو ہر چہرے پر اپنے نقش کندہ کر دیئے ہیں۔ انھیں مٹانے کے لیے شاید کوئی وقت معین نہیں کیا جا سکتا اور یہ لڑکیاں ـــــ اپنی زندگی کی زبوں انجامی کے خوف سے ان کے جذبات چکنے سے قاصر ہیں۔ یہ تو محض شباب کی قدرتی تحریکیں ہیں جو متحرک ہونے کے لیے مچل رہی ہیں ورنہ جوانی اور خوبصورتی تو ان کی زندگی کی سب سے بڑی لعنتیں ہیں۔

دل میں ایک بے بضاعت قسم کا ہمدردانہ لگاؤ جاگ اُٹھنے سے اُسے اس سرزمین کے ہر ذرے میں سیکڑوں التجائیں بلکتی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ اور اسے محسوس ہوا کہ صرف راجی یا اس کی صنف ہی نہیں بلکہ وہاں کی ہر شے کنائے اور استعاروں سے ماورا کسی دوسرے علم سے بے بہرہ ہے کچھ ایسے عالم میں کہ حب الانسان کوشش کے باوجود ماحول کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا اُسے وہاں کی زندگی، وہاں کا ماحول اپنے ذہن کی صاف شفاف تختی پر کچھ لکھتا ہوا محسوس ہوا ـــــ چاہے جو ہے، اِنے گِنے افراد کی ملکیت تو نہیں سبھی کو نِٹھلے بیٹھنے یا چوپٹ کھیلنے کا یکساں حق حاصل ہے۔ جب زندگی کے اختتام پر چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہیں رہ جاتی تو زندگی کے دوران میں کسی قسم کی تفریق کیوں؟ کیا قدرت کو یہ تمدنی، نظام قبول ہے۔ جو چھوٹے بڑے کی تمیز کا جھنڈا لئے انسان

کو گمراہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ یا پھر اس کا علاج کیا یہ ہے کہ انسانی نسل اپنے ابتدائی دور کی طرف پلٹ جائے۔ جاہل، بے وقوف ہو جائے۔ پھر زندگی کی از سر نو تشکیل کے لئے بھی توکل کا اعتبار لازم ہے۔ کل کی آس انسانی زندگی سے کیونکر جدا کی جا سکتی ہے۔ بیداری، تگ و دو مشکلوں کا حل اور گتھیوں کے سلجھانے کا نام ہی تو زندگی ہے —— پچھاڑی ہوئی راہیں یقیناً ان دیکھی راہوں سے ہیچ ہیں۔

اس قسم کے تمام خیالات دراصل راجی کی خاموش بیانی ہی سے پیدا ہوئے تھے اس کے بعد اپنے خیالات کو تقویت پہنچانے کے لئے اس نے گرد و پیش کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کے بعد راجی کو اس کی حقیقی شکل میں دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اور اس وقت بھی جبکہ وہ چوپٹ پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بار بار اپنے تخیل کی پوری قوت کے ساتھ راجی کی صحیح تصویر اپنے ذہن میں ابھارنے کی کوشش کی تاکہ کم از کم اس وقت وہ صرف اور صرف راجی کی بابت سوچ سکے۔ اور کوئی اندازہ قائم کرنے کے قابل ہو جائے لیکن دوسرے ہی لمحے جگر سوز، حسرت بھری نگاہ کا غیر مرئی سا عکس چھوڑتی ہوئی وہ تصویر گویا یہ کہہ کر خلط ملط ہو جاتی —— تم تو دیکھ ہی رہے ہو۔ میں کس ماحول میں پل رہی ہوں —— اور اس ماحول کے متعلق اب وہ زیادہ نہ سوچنا چاہتا تھا۔

غیر ارادی طور پر اُٹھ کر وہ کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا —— راجی سے وابستہ ان تمام تلخ حقایق کو سامنے رکھتے ہوئے اس تذبذب سے

چھٹکارا ناممکن ہے، ایک مرتبہ پھر اس نے اپنے ذہن کی باگ اس کی طرف موڑ دی
شاید گھر والوں نے اسے نہ آنے دیا ہو ——— ہو سکتا ہے وہ میرا ارادہ بھانپ
گئی ہو اور اب پشیمان ہو کہ کل اس نے خواہ مخواہ ایک پردیسی کو اپنے متعلق
غلط سلط سوچنے میں مدد دی ——— یہ محض دل لگی بھی ہو سکتی ہے۔ آخر اس نے
اپنی زبان سے تو کوئی اقرار نہ کیا تھا۔ صرف اس کی آنکھوں سے میں نے وہ
نتیجے اخذ کر لئے تھے ——— مگر نہیں ——— یہ ناممکن ہے۔

تو پھر ممکن کیا ہے؟ اس کے اندر کوئی چیز بول اٹھی ——— وعدے کے
باوجود وہ نہیں آئی ——— تم بھی عجیب ہونق واقع ہوئے ہو ——— ذرا سا
کسی نے تمہاری طرف گھور کر دیکھ لیا کہ تم ہوائی قلعے تعمیر کرنے لگے ———
الف لیلیٰ کی داستانوں کو عالم وجود میں لانے سے پہلے پیٹ پوجا تو کر لو۔
صبح سے انتڑیاں چٹخ رہی ہیں ——— اور وہ سوچنے ہی لگا تھا کہ اُٹھ کر اندر چلا
جائے کہ سحر رات کا واقعہ بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن کے ایک کونے
سے دوسرے کونے تک لپک گیا۔ اس کے قدم وہیں کے وہیں جم گئے ———
عجیب خالی خالی نظروں سے وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

پچھلی ہی رات ڈھولوں کے بے ہنگم شور سے وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا تھا۔
لگاتار ایک گھنٹے تک ڈھولوں کی آواز کانوں کے پردے پھاڑتی رہی تھی۔
اس دوران میں گھر کے تمام افراد جاگ کر اس کے پاس آ اکٹھے ہوئے تھے۔
میزبان سے اسے معلوم ہوا کہ یہ ڈھول ویسی موقعوں پہ پیٹے جاتے ہیں سندھ
میں طغیانی آنے یا بلوچوں کے گھیرا ڈال لینے پر ——— ہر کسی کے چہرے سے خوفناک

ترین صورت میں ڈر اور سہم ٹپک رہا تھا۔ خود میزبان بھی بے حد بدحواس تھا۔ بظاہر تو وہ تسلی آمیز الفاظ میں گھر والوں کو دم دلاسا دیئے جا رہا تھا۔ کہ ان ڈھولچیوں کو دھوکا بھی تو ہو جاتا ہے۔ بارہا ایسا ہو چکا ہے کہ ڈھول پیٹے جانے کے بعد بھی نہ تو دریا کی لہروں کا شور سُنائی دیتا ہے نہ صبح بلوچوں کے خون خرابے کی کوئی اطلاع ملتی ہے مگر اس کے حلق میں ٹوٹ ٹوٹ کر رہ جاتے ہوئے الفاظ ساتھ ہی ساتھ اس بات کی گواہی دیئے جا رہے تھے کہ یہ جھوٹی تسلیاں محض دل بہلاوے کا سامان ہیں اور خود دل بہلانے والا ان کی اہمیت سے منکر ہونے کی ناکام کوشش کر رہا ہے ــــ مگر نہیں میزبان کا کہنا درست ہی ثابت ہوا تھا۔ کیونکہ کچھ ہی دیر بعد کسی قسم کے خطرے کی خبر نہ ملنے سے سب اپنی اپنی جگہ سونے کو چلے گئے تھے اور وہ اس واقعہ کو کوئی خاص اہمیت دیئے بغیر طنزیہ انداز میں سوچتا رہا تھا کہ ڈھولچیوں کی نیند پر دریا کی لہریں اور بلوچوں کے خنجر اس بُری طرح مسلّط ہیں کہ ذرا سی آہٹ پر وہ چونک اُٹھتے ہیں ــــ اور بے تحاشا ڈھول پیٹنے لگتے ہیں۔ یا پھر یہ کھیتوں میں بہتات سے اُگی ہوئی بھانگ کا اثر ہو گا۔

مگر اس وقت ایک نئے انداز سے سامنے آکر اس واقعہ نے اس کی کل پریشانیوں کو سمیٹ کر ایک ہی نقطے پر مرکوز کر دیا اور وہ سر سے پاؤں تک لرز اُٹھا ــــ کہیں سچ مچ ہی تو کوئی قہر نازل نہیں ہو گیا ــــ اپنے میزبان کی بتائی ہوئی باتیں اسے پھر سے یاد آنے لگیں کہ اوپر کی طرف کا طوفان صرف نوجوان لڑکیوں ہی کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے۔ اور صبح تو خاص طور

پر رازدارانہ لہجہ میں اس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان کا کوئی وار خالی نہیں جاتا
کشت و خون تو ایک طرف بعض اوقات کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی اور
وہ ـــــ اور یہ راجی ـــــ عجیب سی ہنسی ہنستے ہوئے وہ کہے جا رہا تھا
کئی مرتبہ بلوچ خاص اسی کو اُٹھانے کی نیت سے آ چکے ہیں۔ مگر اس چھوکری
کے نصیب ہی شاید نرالے ہیں جو کسی بار بھی ان کی زد میں نہیں آ سکی ـــــ
اور پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا ـــــ میں کہتا ہوں راجی قصبے پر ایک
بہت بڑی آفت ہے ۔۔۔۔۔۔

غیض و غضب کے مقامِ اوج تک جا پہنچنے کے باوجود اپنے ارادے
کو ذرا سی شہہ ملتے ہی اس کا ذہن اس طرف گھوم گیا ـــــ بے شک، راجی
کے نصیب انوکھے ہیں۔ وہ ان تپتے ہوئے ریگستانوں میں رہنے کے قابل
نہیں وہ اپنی زندگی کے اونچ نیچ دیکھنے کی خاطر طوفانوں کا انتظار نہیں
کر سکتی۔ پوری رعنائی اور دلکشی کے ساتھ ایک علیحدہ دُنیا اس کی منتظر ہے کہ
جہاں وہ اپنی نیند آپ سو سکے گی۔ اپنی نیند جاگ سکے گی۔ جہاں اس کے
قلب کو پُرسکون رفتار نصیب ہو گی ـــــ بلاشبہ وہ اس سرزمین کی پہلی
خوش بخت جوانی ہے جس میں بچپن اور بڑھاپا ایک ساتھ دخل انداز نہ
ہو سکیں گے۔ میں اسے اس ماحول میں گھٹ گھٹ کر نہ مرنے دوں گا ـــــ
آج ہی رات ـــــ ہاں آج ہی رات ۔۔۔۔۔۔

ذرا دیر کے لئے اس کا خیال اپنے اس غضبناک ارادے کی طرف بھی
پلٹا ـــــ کیا وہ خود ایک طوفان نہیں ـــــ اَن جانا، چھپ کر وار کر رہا

ہے۔ جس کی آمد پر ڈھول نہیں پیٹے گئے۔ راجی گیا اس بھیانک طوفان میں بہہ جانے پر رضامند ہو گئی۔ مگر اس جانب وہ زیادہ دیر تک توجہ نہ دے سکا اس کے دل میں بڑھتا ہوا خدشہ شدید ترین صورت اختیار کر گیا اور اُسے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس وقت اسے کیا کرنا چاہیئے ـــ پھر اس لاانتہا بیقراری سے نجات حاصل کرنے کا اُسے وہی طریقہ سوجھا ـــ کیوں نہ وہ اپنے میزبان سے قصبے میں ہر طرح کے امن وامان کی خبر سننے کے لئے اسے بھی چوپٹ پر بلالے۔ لیکن پھر اس تسکین دہ پیغام سے پیدا ہونے والے حیران کُن نتائج اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ نہیں اس وقت وہ کسی حالت میں بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میزبان یا کوئی اور ہی راجی اور اس کے درمیان حائل ہو ـــ نڈھال سا وہ پھر چوپٹ پر آن بیٹھا۔ اور از سرِ نو راجی کے نہ آنے کے بارے میں سوچنے لگا ـــ

چوپٹ کے چاروں کونے چت لیٹے ہوئے تھے اور گویا اُفق سے ملتی ہوئی ان راہوں کے چوراہے میں سبز، سُرخ، سیاہ اور زرد گٹیاں، حسرت بھری نگاہوں سے کوڑیوں کی طرف تک رہی تھیں

●

میراث

پڑوسن کا ہزار اصرار، ہزار خوشامدیں بھی کل رات ماں کو ڈھولک کی محفل میں شریک ہونے پر رضامند نہ کر سکیں۔ پر ابر آدھی رات تک وہ میرے سرہانے بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتوں سے میرا دل بہلانے کی کوشش کرتی رہی۔ اور میں کنپٹیوں پر ہتھوڑیاں سی چلاتی ہوئی ڈھولک کی آواز پر چھٹپٹاتا رہا۔ ایک عرصے سے میں بیمار ہوں۔ میرا مرض بڑا مہلک ہے۔ ڈاکٹروں نے ہدایات دے رکھی ہیں کہ میرے نزدیک کسی قسم کا شور نہ کیا جائے۔ اونچا بولنے تک کی منا ہی ہے۔ لیکن ان عورتوں کو بھلا کون سمجھائے!

رات میرا سر، میری کمر، میری ٹانگیں دباتے ہوئے میرے دل بہلانے کی خاطر ماں اکثر کہہ اُٹھتی۔ "کل کی چھوکریاں ہی تو ہیں۔ اتنا بھی تو نہیں جانتیں کہ تال بے تال ہو رہا ہے۔ ڈھولک کی آواز میں تو ایک جادو ہوتا۔ ایک نشہ"

اور کبھی کبھی تو کچھ اس قدر جھنجلا اُٹھتی، جانے ابھی ایک ہی جست میں وہاں جا پہنچے گی اور ڈھولک کو سنبھال کر اس ترتیب اور آہنگ سے سر باندھنے لگے گی کہ ساری کی ساری محفل عش عش کر اُٹھے مگر وہ میرے سرہانے سے اس وقت تک نہیں ہلی جب تک کہ ڈھولک کی محفل برخاست نہ ہوگئی اور گڑ بتاشے لے کر واپس گھروں کو لوٹتی ہوئی محلہ والیوں کا گلی میں سے گذرتے ہوئے باہمی ہنسی ٹھٹھول اور فلاں لڑکی کی آواز بہت باریک ہے اسے تو یہ وہ آواز تھی یا گھڑے میں کوا اڈکرا رہا تھا وغیرہ اونچی نیچی آوازیں بالکل ہی معدوم نہ ہوگئیں۔ لیکن آج ـــــــ

آج گلی گوانڈ کی عورتیں بھی ہمارے ہاں آدھمکیں اور ماں سے کہنے لگیں کہ آج تو وہ کسی صورت بھی اسے نہ چھوڑیں گی۔ رات اس کی عدم موجودگی سے سارا مزہ کرکرا ہوگیا یا پھر پڑوسن کے اس کہنے پر کہ اس کا یہی ایک ہی تو نونہال ہے اور یہ دن بار بار آنے کا تو ہے نہیں۔ اس روز تو روٹھا ہوا بھگوان بھی من منوتی کر لیتا ہے یا شاید رات ڈھولک کی ہوچکی بے حرمتی کو ناقابلِ برداشت سمجھ کر ماں نے مان لیا اور مجھے جلد ہی لوٹ آنے کا یقین دلاتی ہوئی ان کے ساتھ اُٹھ گئی۔

اور اس وقت میں تنہا چارپائی پر پڑا ہوں۔

ڈھولک پر ہاتھوں کی تھپک، اس پر ٹھیکری کی چوٹ کانوں کے پردے پھاڑ رہی ہے۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر آنکھیں بند کرکے دم سادھ لیتا ہوں۔ کروٹیں بدلتا ہوں۔ لیکن کسی پہلو چین نہیں پڑتا۔ کمرے کے دروازے

کھڑکیاں، روشندان بند کروائیے تھے۔ لیکن اس اُودھم کو اندر آنے سے کیوں کر بند کراؤں ——— اب ہاتھوں کی تالیوں نے اس ہنگامے میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ اب تھوڑی دیر کے بعد پیروں میں گھونگرو باندھ کر کوئی منچلی ناچنا بھی شروع کر دے گی۔ شادی میں ابھی ایک ہفتہ اور ہے۔ اور اگر اس ڈھولک کی یہی گت رہی تو اس جادو، اس نشے کے زیرِ اثر شاید جس روز پڑوسن کے یہاں ایک نئے فرد کو چوکھٹ میں تیل ڈال کر خوش آمدید کہا جائے گا، ہمارے یہاں لکڑیوں پر گھی ڈال کر ایک پرانے فرد کو الوداع ———

رام دھن ——— یعنی یہ لڑکا جس کی شادی کی خوشی میں دو ہفتوں سے ڈھولک پٹ رہی ہے میرا ہم عمر ہے اور ہم جماعت بھی۔ دونوں کا لڑکپن اکٹھے کھیل کود میں گذرا۔ لیکن انٹرنس کر چکنے کے بعد اس نے تو اپنے باپ کی کباڑ کی دوکان سنبھال لی اور میں جو ایک بہت بڑا ادیب بننے کے خواب دیکھتا تھا گھر کی حالت کے پیشِ نظر کلرکی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ میرے والد تو پھوٹی کوڑی بھی میرے لئے نہیں چھوڑ گئے۔ سُنتا ہوں دادا بڑے حیثیت دار تھے۔ گاؤں میں پکی حویلیاں تھیں۔ آس پاس کے سب دیہاتوں میں وسیع لین دین تھا۔ اپنے پیچھے ہزاروں کی جائداد چھوڑی۔ لیکن بعد میں والد نہ جانے کن کن جھگڑوں میں پھنس گئے کہ جائداد تو ایک طرف، ان کا بال بال قرض میں بندھ گیا۔ ماں بتاتی ہے کہ وہ بھی اسی مرض کے مریض تھے ——— پھر بھی غنیمت ہے کہ کسی طرح سر چھپانے کو یہ چار اینٹیں بچ رہیں ورنہ ———

کباڑ یئے کا کباڑ خانہ اب لوہے کے پکّے مال کی دوکان میں تبدیل ہو چکا ہے لیکن میری تنخواہ ساٹھ سے اسّٹھ نہیں ہوئی اور اگر یہی حالات رہے تو رام دھن جلد ہی کیل بنانے کا کارخانہ جاری کرنے کے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا لے گا۔ اور میں ہمیشہ بیمار رہنے اور زیادہ چھٹیاں لینے کی پاداشس میں بغیر کسی نوٹس کے برطرف کر دیا جاؤں گا۔ —— اس کی شادی اب میرے لئے وبالِ جان بنی ہوئی ہے۔ لیکن دو سال پہلے جب میری شادی ہوئی تھی تو ——

اپنی بہو، یعنی میری بیوی سے ایک مرتبہ ماں نے کہا۔ "بہو، تجھ میں نویلا پن تو نام کو نہیں۔ چِٹّا دوپٹہ اوڑھے رہتی ہو۔ آج کل کے لڑکے تو رنگ روغن ٹیپ ٹاپ کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔" تو جواب میں کہنے لگی۔ "نہیں ماتا جی —— اگر میں آج کل کی لڑکیوں کی طرح گھر کی طرف نہ دیکھوں تو ساٹھ روپے میں خالی میرا سُرخی پوڈر ہی چلے۔" —— کس قدر فریب کن اور حسرتناک جواب تھا۔ وہ جانتی ہے میں دق کا مریض ہوں۔ وہ ایک دق کے مریض کی بیوی ہے ساٹھ روپے کی آڑ لے کر اس نے —— ماں اس بات پر کتنا خوش ہوئی تھی وہ سمجھتی ہے بہو بہت سوجھ بوجھ کی مالک ہے لیکن یہ تو میں ہی سمجھتا ہوں کہ —— لیکن میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے حاصل —— خیر یونہی سہی۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ وہ ساٹھ روپے میں رُوکھی سُوکھی چلائے گی۔ ہو گا، میں ذرا تندرست ہولوں وہ رنگ جما کر دکھاؤں گا کہ دانتوں تلے انگلیاں داب لے گی۔ میرے پاس دو سو روپے نقد بنک میں جمع ہیں۔ اگر وہ بیماری

میں نہ اُٹھ گئے تو کھاٹ چھوڑتے ہی کچھ پیسے اِدھر اُدھر سے بٹور کر ایک ہفتہ وار پرچہ نکالوں گا۔ اس وقت تک حالات بھی کچھ سُدھر جائیں گے پھر کیا ہے، خرچ ٹھہرا کاغذ اور چھپائی کا۔ نظمیں اور مضامین تو مفت میں آنے کی چیزیں ٹھہریں۔ کبھی کبھار اگر کوئی خستہ حال شاعر یا ادیب بہت زور مارے تو دو دن کے سگرٹ پان کا خرچ بخش دیا جائے۔ نہیں تو ایسا کیا ہے۔ جو بِلا معاوضہ دے اور احسانمند ہو اُسے آیئے آیئے، اور جو معاوضہ طلب کرے اُسے سنایئے، قبلہ مہنگائی کا زمانہ ہے کاغذ کو تو جیسے آگ لگ گئی ہے۔ اندازہ فرمایئے۔ (فرمایئے کہنا سونے پر سہاگہ ہوگا) ایک صفحے پر ہمارا اپنا خرچ چالیس سے کم نہیں اُٹھتا۔ اپنا گھر بھی پورا نہیں پڑتا۔ پھر بھی خود کو گھاٹے میں رکھ کر ادب کی خدمت کیئے جا رہے ہیں۔ خدا کا واسطہ دینے کے بجائے دُنیا سے اس کی دُعا کیجیے۔ ادیبوں شاعروں کی دعائیں بڑی کارگر ہوتی ہیں۔ جونہی وقت اپنی اصلی حالت پر آئے گا۔ آپ کی سب کسریں گِن گِن کر پوری کر دی جائیں گی ——— خدانخواستہ اگر کوئی ڈھیٹ قسم کا انسان یہ کہنے پر اُتر آئے کہ جناب آج سے دس برس پہلے بھی آپ لوگ یہی کہا کرتے تھے۔ کبھی پھوٹی کوڑی کا مُنہ نہ دکھایا تھا تو گھڑا گھڑایا جواب اپنے پاس ہے ہی۔ کہ حضرت وہ زمانہ، وہ نظام اور تھا۔ وہ رسائل، وہ مالک اور تھے۔ یعنی تب سب کچھ اور تھا اور اب سب کچھ اور ہے۔

سرمایہ داروں کی تصویریں چھاپیئے ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے تک ملانے سے گریز نہ کیجیے۔ بوقت ضرورت کسی سیاسی شہسوار

کا راز فاش کر دینے کی دھمکی دیجیے اور اگلے دن سر بھر کھنکھناتی تھیلی لے کر مسکرا دیجیے۔ بس پھر گیا ہے اپنا تینگ آسمان سے جا لگا۔ آپ کے اعزاز میں دعوتیں دی جا رہی ہیں۔ ملک کی نامور ہستیوں کے تعریفی خطوط چلے آ رہے ہیں۔ اور بینک بیلنس ہے کہ روز افزوں ہوتا چلا جا رہا ہے ——— اِدھر آپ ہیں کہ ملک اور ادب کی خدمت کے سلسلے میں ٹانگ پر ٹانگ ٹکائے دفتر میں بیٹھے جمائیاں لے رہے ہیں اور پاس پان کی گلوریاں جبڑوں میں بھرے کوئی ادھوراشاعر ادھورا فن کار اونچے نیچے سُروں میں اپنا تازہ کلام گا گا کر سُنا رہا ہے ——— زیادہ مصروفیات کی وجہ سے کچھ ہرج نہ ہوگا۔ اگر ایک عدد اڈیٹر بھی رکھ لیا جائے۔ بہت دم مارے گا۔ تو تیس چالیس پر تان ٹوٹ جائے گی۔ آخر کام بھی کیا ہے سفت میں آئے ہوئے مضامین پر سرسری نگاہ ڈالنا، دن میں دو تین بار چھاپے خانے اور کاتبوں کے گھروں کے چکر کاٹنا اور پروف پڑھنا ——— گھر میں زیورات بن چکے۔ اعلیٰ قسم کا فرنیچر خریدا جا چکا۔ نوکر چاکر اِدھر اُدھر ہٹر گشت کر رہے ہیں اور بنگلے کے باہر موٹر کو جھاڑتا پونچھتا شوفر ہم اندر والوں کا انتظار کر رہا ہے اور میں جھنجھلا جھنجھلا کر کہہ رہا ہوں ——— "کمال کر رہی ہو۔ شاپنگ کا یہی تو وقت ہے اور مجھے ابھی پارٹی میں بھی جانا ہے۔"

لیکن بیوی صاحبہ ہیں کہ ان کی ڈریسنگ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ خدا خدا کر کے پوشاک چننے اور پہننے کا مرحلہ طے ہوا کہ غازے پوڈر پہ پل پڑیں۔ تب دل ہی دل میں اس سے پوچھنے لگتا ہوں۔ کہو، اب تو کوئی ساٹھ روپے

اس میک اپ کے لئے ناکافی ہیں نا اور وہ ناخنوں پر پالش کرتے ہوئے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرا کر آنکھوں کی پتلیاں نچانے لگتی ہے ——
—— لیکن ماں ابھی تک کیوں نہیں آئی۔ اسے اب تک آجانا چاہیئے تھا —— خدا کی مار اس ڈھولک کی محفل پر۔ یہ تو میری جان لے کر ہی دم لیگی دن کے وقت بھی جب کبھی آنکھ لگنے پاتی ہے پڑوسن کی برادری کے لڑکے بالے ننھی منیاں ڈھولک سے برسرِ پیکار ہو جاتے ہیں۔ رات کی محفل میں ان کی کوئی شنوائی نہیں ہو سکتی۔ غالباً یہی سبب ہے کہ دن کے وقت موقع بے موقع بے اختیار ان کے ہاتھ ڈھولک کی طرف اُٹھ جاتے ہیں۔ آخر انھیں بھی تو ڈھولک کی خوشامد منظور ہے —— وہ جادو' وہ نشہ!!

گانا بٹھانے سے پہلے پڑوسن نے محلّہ بھر میں شکر پارے بٹوائے تھے۔ شکر پاروں کو قبول کرنے کی صورت میں کم از کم دو روپے شگن میں دینا لازم ہو جاتا ہے۔ چند ایک جہاں دیدہ عورتوں نے صلاح و مشورہ کیا کہ اپنی ذات برادری سے نبٹنا نہیں دوسرے سمبندھی کیوں کر بنائے جائیں۔ پھر یہ لوگ ٹھہرے کرایہ دار اور کرایہ داروں کا کیا ٹھکانا۔ آٹھ دس آنے کی شکر شیرینی بھجوائی اور دو روپے کھرے کر لئے۔ لیکن زاں بعد سب نے مل کر پڑوسن کے سبھاؤ کی حلیمی اور ملن برتن کی تعریف کرتے ہوئے بدھائی دے کر شکر پارے جھولیوں میں ڈلوا لئے —— کل جب حسبِ معمول وہ میرا حال پوچھنے آئے گی تو میں اسے کہوں گا —— چاچی'

تم یہاں اپنا مکان کیوں نہیں بنوالیتیں۔ اب تو خدا کا دیا سب کچھ ہے ــــ لیکن اسے مجھ پہ کیوں ذرا بھی رحم نہیں آتا ؟ وہ کیوں اس نام نہاد خوشی کو مجھ پر قربان نہیں کر دیتی۔ مجھے بھی تو وہ اپنا بیٹا ہی کہتی ہے۔ جیسا رام دھن ویسا منوہر لال۔ رام دھن اور منوہر لال میں کوئی فرق نہیں۔ کئی مرتبہ میری ماں کے ساتھ بیٹھ کر میری جوانی، میری بیوی کی تشنۂ تکمیل خواہشات، میرے ہونے والے بچّے کے حسرتناک نصیبوں پر آنسو بہا چکی ہے۔ دعائیں دے چکی ہے کہ میں جلد از جلد نو بہ نو ہو جاؤں۔ ابھی کل ہی غمگین نگاہوں سے میرے چہرے کی طرف دیکھتی ہوئی ماں کو دلاسہ دے رہی تھی۔ بھگوان کی مرضی بھگوان اتنا بے نیاز نہیں ــــ بھگوان ــــ ہونہہ ــــ لیکن اے بھگوان کی نیک بندی آج تم ــــ

ڈھولک بظاہر بے جان ہے مگر اس میں سے کیسی کیسی آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ ایک جنی ہاتھوں کی تھپک دیتی ہے۔ دوسری ٹھیکری کی چوٹ سے اس آواز میں نیا ہی رنگ بھرتی ہے۔ باقی سہیلیاں تالی بجا بجا کر یا ناچتے گاتے اپنی اپنی شخصیت کا جوہر پیش کرتی ہیں اور وہ کہ جنھیں کوئی بھی ہُنر نہیں آتا چپ چاپ بیٹھی رہتی ہیں اور ٹکر ٹکر دیکھتی ہیں۔ کیا کریں نظام ہی ایسا ہے ــــ اس نظام کے خلاف اس ایک طرفہ نظام کے خلاف کوئی لفظ، کوئی کلمہ ان کی زبان پہ نہیں آسکتا وہ جُرأت ہی نہیں کر سکتیں اور یہ گیت ــــ

وگدی رہے راوی ڈھولا

وگدی اے راوی ماہی وے وچ پتا چلائی دا ڈھولا

میں نہ جمدی ماہی وے، توں کتھوں ویائی دا ڈھولا

ـــــ یعنی راوی دریا میں چولاہی کا پتا بہے جاتا ہے ۔ میرے بالم اگر میں پیدا نہ ہوتی تو تمھارا بیاہ کیونکر ہوتا ۔

ہونہہ ـــــ بیاہ ـــــ گویا سچ مچ ہی اس کے پیدا نہ ہونے سے ـــــ لیکن پھر دوسری عورت بھی تو یہی گیت گا سکتی تھی ۔ ٹھیک ہی تو ہے ـــــ اپنے بالم کی اے نٹ کھٹ دُلہن تمھارے پیدا نہ ہونے سے اس کا بیاہ نہ ہو سکتا تھا ۔

ـــــ ادھی راتیں ماریئی ـــــ ہائے ماریئی

بھن چھڈیاں ہائے نی بھن چھڈیاں، ملوک جھیاں ہڈیاں

کیا خوب! اب کیوں روتی ہو ۔ آدھی رات کے وقت مجھے پیٹا گیا ۔ اس نے میری نرم و نازک ہڈیاں توڑ کر رکھ دیں ـــــ اب کہو اگر تم پیدا نہ ہوتیں تو کون اپنی ہڈیاں تڑواتا ۔ اب تو تم بھی بار بار کہہ رہی ہو گی کہ تم پیدا نہ ہوتیں ۔

اپنی آواز میں کس قدر سوز بھر لیتی ہیں یہ عورتیں، کوئی مسئلہ، کوئی موضوع ایسا نہیں جو انھوں نے گیتوں کے سانچے میں نہ ڈھال رکھا ہو ۔

ـــــ میری بیوی بھی آج یہاں ہوتی تو اس کی زبان سے بھی نہ جانے کیسے کیسے گیت نکلتے ـــــ ان دنوں وہ میکے گھر میں ہے ۔ بالم اور گیتوں کی دُنیا سے دُور ـــــ لیکن وہاں بھی تو پڑوس میں کسی نہ کسی

کے ہاں بیاہ رچ رہا ہوگا۔ یہی تو وہ رُت ہے جب گھر گھر ساہے چمک اُٹھتے ہیں —— بیاہ —— بیاہ سے قبل، بیاہ کے بعد —— لیکن سبھی خاوند میری طرح دق کے مریض تو نہیں ہوتے۔ ان کی بیویوں کو اپنے آپ پر، اپنے خاوندوں پر، بجا طور سے ناز ہوتا ہے۔ ان کے گنوارے سپنوں کا ماحصل۔ تندرست اور برسرِ روزگار خاوند —— نہ جانے میں کب اس چارپائی سے اُٹھوں گا۔ اس مرض سے میری کب خلاصی ہوگی —— کون سی بھسم ہے جو میں نے نہیں چاٹی —— کوئی معجون ایسا نہیں جو میرے حلق سے نہ اُترا ہو۔ لیکن میری حالت دن بدن گرتی ہی جا رہی ہے۔ مجھ میں اُٹھ کر بیٹھنے تک کی سکت نہیں رہی اور یہ ڈاکٹر اور حکیم —— یہ تو ہمیشہ سے یونہی کہتے آئے ہیں۔ یونہی کہتے رہیں گے۔ فکر کی چنداں ضرورت نہیں —— بس پرہیز چاہیئے۔ ہر قسم کا پرہیز یا پھر یہ رنگ رنگ کی دوائیاں پیتے چلے جاؤ۔ اس نسخے میں مُردے کو کھڑا کر دینے کی شکتی ہے —— ان دوائیوں کے بھی کیا کیا عجیب رنگ ہوتے ہیں۔ سُرخ، سُفید، مٹمیلے، کالے، نیلے، پیلے — لیکن اصل میں ان کا اپنا رنگ کوئی بھی نہیں —— یہ مستعار کے رنگ بھلا کسی کو کیا فائدہ بخش سکتے ہیں۔ مجھے ان دوائیوں، ان رنگوں سے چڑھ ہے۔ خدا واسطے کا بیر ہے —— یہ مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچائیں گے —— لیکن اس نفرت اور بیزاری اس لاینحل ناامیدی کے باوجود میں نے کبھی ناغہ نہیں کیا۔ بلکہ اکثر دن بھر کی تمام دوائیں ایک ہی مرتبہ پی جاتا ہوں کہ

شاید ــــ شاید ــــ

پاس پڑوس کی تمام عورتیں باری باری بہو کو بُلا بھیجنے کے لئے ماں سے کہہ چکی ہیں ــــ آدمی کا کیا بھروسہ ــــ بھگوان نہ کرے ــــ مگر ماں ہمیشہ یہی کہہ کر ٹال دیتی ہے کہ اس کے آجانے سے بدپرہیزی ہوجائیگی ــــ شاید، شاید ایک حد تک یہ درست بھی ہو مگر میرے خیال میں وہ اسے اس لئے بھی نہیں بلوا بھیجتی کہ پہلی پیدائش میکے ہی میں ہونی چاہیئے۔ اور جیسا کہ ناتی اپنا آپ ظاہر کرتے ہیں اس موقع پر بہت کچھ آنے کی توقع ہے اور وہ نہیں چاہتی کہ بہو کو بلوا کر ہاتھ آنیوالے مال متاع کو نظر انداز کر دیا جائے ــــ آخر دستور بھی تو کوئی چیز ہے ــــ آگے ہی گھر میں بیماری ہے اس پر بہو کا بوجھ کون جھیلے گا۔ میں اکیلی جان کس کس کی سدھ لوں گی ــــ بھگوان بھلی کریں گے ــــ بھگوان ــــ ماں شاید جانتی ہے کہ اس مرض کا روگی برسوں ایڑیاں رگڑتا ہے۔

میرے والد بھی تو پورے چار برس تک ہڈیاں چٹخاتے رہے تھے ــــ اور جب کبھی نمناک آنکھوں سے میری طرف دیکھتی ہوئی ماں کہنے لگتی ہے ــــ بیٹا تیرا دادا کتنا بھاگوان تھا۔ اس نے تیرے پتا کو کیا نہیں دیا ــــ تو میری آنکھوں میں اپنے خاندان کی تاریخ پھر جاتی ہے ــــ پتاجی دادا کی چھوڑی ہوئی جائداد کو سنبھال کر نہ رکھ سکے اور ایک دن تو قسمت ہی پھوٹ گئی جو اُن کا دیوالہ پٹ گیا ــــ اور میں

سوچنے لگتا ہوں کیا سچ مچ ہی وہ دیوالیہ تھے۔ میرے لئے چھوڑنے کو
ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ اور ایک تکلیف دہ احساس میرے ذہن پر چوٹیں
لگانے لگتا ہے۔ میرے خوابوں کے محل ڈھے جاتے ہیں اور کہیں دُور
سے میری بیوی کا افسردہ اور اندوہناک چہرہ اُبھر آتا ہے۔ اور وہ اپنے
ننھے کو اُٹھائے میری طرف بڑھتی چلی آتی ہے اور میرے کانوں میں کچھ غیر
واضح سے الفاظ گونجنے لگتے ہیں۔ اور ان الفاظ کی بازگشت کائنات کے
ذرّے ذرّے میں لرزنے لگتی ہے۔ تیرے پتاجی — ! تیرے پتاجی!
ننھے! ننھے!!